رجسٹرڈ نمبر اے ۴-۱۱
جلد ۱۳ - شمارہ ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ کو شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صر ہندوستان سے باہر علاوہ محصول عہ

فہرست مضامین اپریل ۱۹۲۸ء

ملاحظات ۲
کلام درد کے ساتھ بیدردیاں "نرگس" ۵
قطرۂ آتشین (فسانہ) ۲۲
ملکہ نرگس بیگم سعیدی بی اے علیگ ۲۸
فلسفۂ مذہب سید مقبول احمد بی اے ۳۶
چنگاری (فسانہ) ۴۰
لارڈ رپن کا عہد حکومت ض-ا-ب بی اے ۴۶
ڈائری کا ایک ورق ۵۲
چہ می گوئیاں ۵۸
لکھنؤ کا ایک غیر لکھنوی شاعر ۶۴
نقد الشعر کیفی چریاکوٹی ۷۶
منظومات :- تسکین جاوید روش صدیقی ۸۱
" دامن کوہ غلام ربانی عزیز ۸۳
" واردات امین حزیں ۸۳
" شاعر کا ترانہ ذوقی ۸۴
" خوشی اور غم افسر میرٹھی ۸۴
غزلیات :- آزاد انصاری، اکبر حیدری ۸۵-۸۸
" اثر لکھنوی تبسم نظامی
" جگر بریلوی، حافظ غازی پوری
" کیف مرادآبادی، کیفی چریاکوٹی
باب الاستفسار ۸۹
معلومات ۹۲-۹۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۳ | اپریل سنہ ۱۹۲۸ء | شمار ۴

ملاحظات

ترقیاں دو قسم کی ہیں، ظاہری و معنوی، جنھیں زیادہ اصطلاحی صورت میں مادی و روحانی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہری ترقی کا معیار یہ ہے کہ دولت وافر ہو، اسباب راحت فراواں ہوں، اور سامان عیش و تنعم کثیر۔ معنوی ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ قلب پُر سکون ہو، دماغ مطمئن ہو اور روح بے نیاز و مستغنی۔ ہر چند دونوں کا اجتماع محال نہیں، لیکن کمیاب ضرور ہے، اس لئے جو لوگ زیادہ سنجیدہ اور متین ہیں، وہ ہمیشہ روح کو جسم پر ترجیح دیتے ہیں اور دیبا و حریر کی نرمی سے زیادہ خشونت گلیم کو پسند کرتے ہیں۔ یہ ہے فلسفہ اخلاقیین کا اور غالباً بڑی حد تک درست ہے۔ اڈیسن اور فورڈ کا مسلک اس سے بالکل جُدا ہے، ان کے ہاں مادی ترقی بھی روحانی ترقی کی طرح لامحدود شے ہے اور انکا قول ہے کہ دولت کی فراوانی، ہیئت اجتماعی کا استحکام ہے اور یہی وہ مقصد اصلی فطرت کا ہے جسے نہ مسیح کا درس رہبانیت پورا کر سکا، نہ چنگیز و سکندر کی خون آشام تلوار ——— یہ نظریہ بھی بہت خوشنما اور قرین عقل معلوم ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں ایک جماعت اور بھی ہے جو نہ اُس فلسفہ کی لذت آشنا ہے، نہ اِس نظریہ کی یعنی نہ اس غریب کے پاس دولت ہے نہ روحانیت، نہ اسباب راحت روح ہیں نہ سامان عشرتِ جسم پھر لطف یہ ہے کہ وہ زندہ بھی رہنا چاہتی ہے اور لطف و آسائش کے ساتھ!!

ما را ہنوز عربدہ با خویشتن بس است

میں نے اس وقت یہ ذکر کیوں چھیڑا؟

نگار تجارتی اصول کو پیش نظر رکھ کر جاری کیا گیا اور اس وقت تک اسی اصول پر چلایا جا رہا ہے ظاہری ترقی کی لحاظ سے غالباً یہ امر کم امید افزا نہیں کہ اب وہ ایک بجلی سے چل سکنے والی پرس مشین کا بلا شرکت غیرے مالک ہے، اسی طرح معنوی ترقی کے لحاظ سے دیکھئے تو یہ حقیقت کم دلچسپ نہیں کہ شاید ہی ہندوستان کا کوئی رسالہ ایسا ہو جو اس کی ادائے سربلندی سے نہ جلتا ہو۔ لیکن با اینہمہ حقیقی معنے میں مجھے نہ اُس پر اطمینان ہے نہ اس پر افتخار، کیونکہ مادی ترقی کے لحاظ سے اگر ایک طرف دولت قارون میرا نصب العین ہے تو معنوی ارتقا کی حیثیت سے دوسری طرف میرا ارادہ "الہامات" پر چشمک زن نظر آتا ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ ممکن ہے لیکن محال، یہ محال ہے، مگر ممکن۔ یعنی آج قارون کی طرح بہت سے دولتمند موجود ہیں لیکن میں نہیں ہو سکتا اور آیات وجدانی کی صورت سے میں بھی اکثر چیزیں پیش کر سکتا ہوں مگر خود مجھی کو ان پر ایمان لانے میں تامل ہوگا، چہ جائیکہ ساری دنیا۔

الغرض یہ ہے میری کشمکش کا عالم جب سے لکھنؤ میں آنے کے بعد نگار اور نگار پرس دونوں کو سنبھالنے کی خدمت میرے سپرد ہوئی ہے اور کس قدر شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ متوسط جماعت کی بے بال و پری بھی کتنا بڑا قہر ہے۔ علی الخصوص اس وقت جبکہ اس کے کسی فرد میں ولولۂ پرواز ضرورت سے زیادہ ودیعت کیا گیا ہو۔

ناظرین نگار کے سامنے یہ افسانہ صرف اس لئے چھیڑا جاتا ہے کہ اگر وہ توسیع اشاعت کو اپنا فرض نہیں سمجھتے تو کم از کم وہ یہ تو آسانی سے کر سکتے ہیں کہ اگر انھیں کبھی پرس سے کام لینے کی ضرورت پڑے تو سب سے پہلے نگار پرس کو یاد کریں، جو بہ نسبت دیگر مطابع کے یقیناً زیادہ مستحق اعانت ہے۔

نگار اور اڈیٹر نگار کے خلاف پروپگنڈا ہمیشہ ہوا ہے اور ہوتا رہیگا۔ اس لئے جائے حیرت نہیں اگر مقامی فضا سے بھی کبھی کبھی اس نوع کی آوازیں سننے میں آئیں۔ میرے بعض احباب نے خصوصیت کے ساتھ مجھے متوجہ کرنا چاہا تاکہ میں کوئی جواب دوں، لیکن انھیں شاید اس کا علم نہیں کہ اس باب میں میرا مسلک ہمیشہ "بگزار تا بمیرد در رنج خود پرستی" رہا ہے۔ اور میں ایسی آوازوں کو صرف "صیحۂ موت" سمجھتا ہوں۔

اس ماہ کے مضامین میں فلسفۂ مذہب، لارڈ رپن، اور نقد الشعر، مسلسل چلے آ رہے ہیں اس لئے مزید تقریب و تعارف کی ضرورت نہیں۔ یہی حال چنگاری اور ڈائری کا بھی ہے۔ فسانۂ "قطرۂ آتشیں" کی خصوصیات کو اسی جگہ نوٹ کے ذریعہ سے ظاہر

کردیا گیا ہے۔ لکھنؤ کا ایک غیر لکھنوی شاعر خالص تنقیدی مضمون ہے جسمیں بلا رو رعایت جناب آسی کی شاعری کے متعلق میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ممکن ہے لکھنؤ کے بعض حضرات اس کو معاندانہ نگاہ سے دیکھیں، لیکن ان کی کج بینی کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ چہ می گوئیاں صرف فکاہی رنگ کا مضمون سمجھکر مطالعہ کرنا چاہئے۔ ملکہ "نرگس بیگم" تاریخی مضمون ہے گو چنداں اہم نہیں۔ جناب آرگس کا مضمون کلام درد کے متعلق خاص چیز ہے اور ایک ایسے "فتنۂ لغویہ" کا سدباب ہے، جس کو اگر اسی کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو کچھ زمانہ کے بعد اس کے اثرات کو مٹانا دشوار ہوجاتا۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا حبیب الرحمان شروانی جو اپنی سنجیدگی ذوق اور انصاف پسندی کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتے ہیں. عملاً ان اغلاط کے محو کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔ جو نظامی پریس بدایوں کے نسخہ میں پائی جاتی ہیں اور جن کی سب سے بڑی ذمہ داری مولانا موصوف پر اس لیئے عاید ہوتی ہے کہ انھوں نے اس نسخہ کے صحت کی توثیق فرمائی ہے۔

آئندہ ماہ کی اشاعت میں جناب آرگس کا ایک معرکۃ الآرا مضمون تذکرۂ آبحیات پر درج کیا جائے گا جس میں ناقابل تردید دلایل سے کام لیکر مولف آبحیات (مولوی محمد حسین آزاد) کی غلط بیانیوں، وسیہ کاریوں اور تحریف نگاریوں کو پیش کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ اردو کا یہ سب سے زیادہ مشہور تذکرہ، کس قدر لغو، غلط اور گمراہ کن ہے۔ اسی موضوع پر ایک مضمون جناب امتیاز احمد صاحب بی اے (علیگ) کا بھی ہوگا جس میں موصوف نے مولف آبحیات کی صرف ان درازدستیوں کو دکھایا ہے جو درد کے ساتھ روا رکھی گئی ہیں۔

حصۂ نظم میں شاعر کا ترانہ۔ خواجہ مسعود علی ذوقی بی اے (علیگ) کا ہے جسمیں انھوں نے ایک طرف اپنے فطرت پرست ذوق کو کامیابی کے ساتھ نمایاں کیا ہے، اور دوسری طرف ایک شاعر کے لایعنی مشاغل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نظم ہونے کے لحاظ سے یہ ترانہ خوب ہے۔ جناب اثر کا قطعہ خوشی اور غم ان کے مصلحانہ رنگ میں ہے اور دلچسپ ہے۔ جناب عزیز کی نظم۔ دامن کوہ ایک طویل نظم کا ٹکڑا ہے جس سے ان کا ابداعی رنگ ظاہر ہے۔ واردات میں امین حزیں کا وہی پیام مستور ہے جس کے وہ قدیم علمبردار ہیں۔ تسکین جاوید۔ روش صدیقی کی نظم ہے اور اچھی ہے۔ غزلوں میں جناب اثر لکھنوی کی غزل خاص مرتبہ کی ہے۔ جگر بریلوی کی غزل بھی قابل داد ہے اور دیگر شعرا کی غزلوں میں بھی بعض بعض شعر بہت اچھے ہیں

امین سلوتوی جن کے متعلق نگار کی کسی گزشتہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا کہ نگار کے شعبۂ نظم سے وابستہ ہوگئے ہیں۔ اب علحدہ ہوگئے ہیں اور ان کو ادارۂ نگار سے کسی قسم کا تعلق باقی نہیں رہا ہے

نیاز فتحپوری

کلام درد کے ساتھ

نظامی پریس کی بیدردیاں

اور

مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کی غیر ذمہ دارانہ مقدمہ نگاری

حال میں مجھے ضرورت ہوئی کہ خواجہ میر درد کے دیوان پر ایک نظر ڈالکر ان اغلاط کو جو کاتبوں اور مصححوں کے تصرفات سے پیدا ہو گئے ہیں دور کروں اسی لئے سب سے اول جستجو یہ ہوئی کہ کوئی صحیح نسخہ ملجائے چنانچہ نہایت کاوش اور محنت کے بعد ایک نسخہ بہم پہونچا جو مصنف کے انتقال کے بہتر برس کے بعد کلاں کوٹھی مطبع محمدی لکھنؤ میں علم دوست ہنر پرور مقبول الدولہ احسان الملک کپتان مرزا مہدی علی خاں بہادر قبول ثابت جنگ کے اہتمام - منشی الطاف حسین کی تحریک اور سعی، اور محمد یعقوب صاحب کی "تصحیح" سے شائع ہوا ہے دستیاب ہوا - یہ نسخہ ۱۲۷۱ھ ماہ شوال میں طبع ہوا ہے جس کو اب چھہتر برس ہو گئے - مصحح مرحوم نے آخر دیوان میں لکھا ہے "کہ اکثر نسخے قلمی خدا جانے کہاں کہاں سے بہم پہونچا کر ہزار جانفشانی سے ایک دیوان ترتیب دے کے ابتداء ماہ شوال ۱۲۷۱ھ میں چھپ کے باعث روشنی چشم نظارگیاں و سبب مسرت دل مشتاقاں ہوا"

مگر میں نے محض اس نسخہ پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ جستجو جاری رکھی اور آخر کار ایک ناتمام قلمی نسخہ جس کی کتابت اور کاغذ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی طرح سو سوا سو برس سے بعد کا لکھا ہوا نہیں ہے دستیاب ہوا - یہ نسخہ ناتمام ضرور ہے مگر جس قدر ہے نہایت صحیح معلوم ہوتا ہے -

تیسرا نسخہ مطبوعہ نولکشور بھی تھا اس میں اُن دونوں نسخوں سے بہت زیادہ اختلاف تھا اور اکثر جگہ یہ اختلاف غلط تھا - میں چاہتا تھا کہ تصحیح شروع کروں، مگر اسیوقت مجھے میرے ایک قابل دوست نے بتایا کہ اس وقت ہندوستان میں خواجہ میر درد کا دیوان نظامی پریس بدایوں میں اس خوبی اور اہتمام سے طبع ہو چکا ہے کہ اس سے بہتر کوئی صحیح نسخہ دستیاب ہونا نہ صرف مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہے -

چنانچہ نسخہ مطبوعہ نظامی منگا لیا گیا - حقیقتاً اس کی طباعت کتابت کاغذ وغیرہ اس قدر دلکش ہیں کہ ایک دیکھنے والا کتاب کے حسن و قبح کو دیکھے بغیر اس کی خوبی کا قایل ہو جاتا ہے - چہ جائیکہ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر کا ایک محققانہ اور فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہو - نواب صدر یار جنگ لکھتے ہیں :-

حیدر آباد میں ایک سے زائد قلمی دیوان درد کے نسخے میرے ہاتھ آئے - میں نے سید معین الدین صاحب صاحب کی فرمایش سے میں نے سید معین الدین صاحب صاحب شاہجہاں پوری مترجم نپولین اعظم وغیرہ کو تصحیح و مقابلہ کی تکلیف دی اہل ادب کو ممنون ہونا چاہیے کہ نہایت محنت و کاوش

دیدہ ریزی سے انھوں نے ایک صحیح نسخہ مرتب فرمایا۔۔۔۔ اسی نسخہ سے یہ دیوان طبع ہوا ہے۔ طبع ہونے کے بعد جب میں حیدرآباد سے حبیب گنج آیا تو کتب خانہ میں ایک قدیم مطبوعہ نسخہ موجود ملا۔ جو دہلی کے مطبع مصطفائی میں ۱۸۵۵ء میں اہتمام سے طبع ہوا تھا۔ یہ نسخہ بہت صحیح ہے اور متعدد نسخوں کے مقابلہ سے چھاپا گیا ہے۔ میں نے اس نسخہ سے بھی مقابلہ کی خواہش سید معین الدین صاحب سے کی اور انھوں نے مہربانی سے محنت کرکے مقابلہ کیا۔ یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ حالیہ مطبوعہ نسخہ، مطبوعہ نسخہ قدیم سے بالکل مطابق نکلا صحت میں بھی اور مقدار کلام میں بھی"۔

یہ ہے وہ عبارت جسے دیکھکر ہر شخص کو اس نسخہ کی صحت پر یقین سے آنا چاہئے۔ میں جناب معین الدین سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن پھر بھی ان دعاوی نے مجھکو اس بات کی اجازت دی کہ میں اپنے نسخہ کو مطبوعہ نظامی سے مقابلہ کروں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خیال پیدا ہوا کہ کم سے کم اپنے قدیم نسخے اور قلمی نسخے، اور نظامی نسخہ کو مطابق کرکے دیکھوں۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے نظامی پریس کے نسخہ کو بدترین نسخوں میں بھی سب سے زیادہ بدتر پایا۔ اس میں تو کلام نہیں کہ اس نسخہ کو صحیح کیا گیا ہے۔ مگر اس طرح کہ جابجا کلام پر اصلاحیں دیدی گئی ہیں اور ایسی بری کہ اگر اسی دیوان کا رواج ہوگیا تو چند روز کے بعد خواجہ میر درد کے کلام کا اردو دنیا میں دستیاب ہونا ممکن نہ ہوگا۔

اختلافات اور اغلاط ایک ہی طرح کے نہیں ہیں بلکہ مختلف قسم کے ہیں۔

(۱) وہ اغلاط جو شعر کو غلط نہیں کرتے۔

(۲) وہ اغلاط جو شعر کا مفہوم بدل دیتے ہیں۔

(۳) وہ اغلاط جو شعر کو بے معنی اور مہمل بنادیتے ہیں

(۴) اغلاط زبان

(۵) اغلاط کتابت

(۶) بعض اغلاط عروض۔ کہیں یہ معمولی ہیں اور کہیں نہایت خطرناک۔

یہ کہدینا ضروری ہے کہ کسی کتاب کی تصحیح محض قلمی نسخے ہی پر منحصر نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے لئے درایت۔ نظر۔ رسائی ذہن وغیرہ کی بھی ضرورت پڑتی ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ تمام قلمی اور قدیم نسخے بھی صحیح نہیں ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ بعض نسخوں کو دیکھکر خود بخود یقین ہوجاتا ہے کہ غلط ہیں، باوجود اس قدر بُری طباعت کاغذ و کتابت وغیرہ کے اس نسخہ سے زیادہ صحیح ہیں۔ بہرحال سب کے سب اختلافات مسلسل لکھے گئے ہیں علیحدہ علیحدہ لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔ بہت سے ایسے اغلاط جو یقینی سہو کاتب سمجھے گئے ہیں نظر انداز کردئے ہیں اختلافات اور اغلاط کا سلسلہ یہ ہو کہ جو اشعار درج کئے گئے ہیں وہ نظامی نسخہ کے مطابق ہیں:-

جس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے   کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا

جس کی بجائے دوسرے نسخوں میں اُس ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ یہ ترجمہ ہے براں مسند عزت کا اور یہی شان لفظی ترجمہ کی پہلے رائج تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو خلاف فصاحت سمجھکر جس کردیا گیا اور اسپر غور نہ کیا گیا کہ درد کے زمانہ میں جو اسلوب بیان

رائج تھا اس کا کیا اقتضا ہے۔

ہے خوف اگر جی میں تو ترے ہی غضب کا　　　اور دل میں بھروسا ہے تو تیرے ہی کرم کا

غضب کا کے بجائے دوسرے نسخے میں سے ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ اس صورت میں توافق ردیف سے مطلع کی صورت پیدا ہوجاتی ہے جو فصحا کے نزدیک عیب ہے۔ بجاے اور دل کے صرف در دل ہے۔ الف نہیں ہے۔ اور یہی صحیح ہے میر درد اور ان کے معاصرین کی یہی زبان تھی:۔

دونوں جہاں کو روشن کرتا ہی نور تیرا　　　اعیاں ہیں مظاہر ظاہر ظہور تیرا

بجائے دونوں جہاں کے نسخۂ قدیم اور کشوری میں۔ ماہیتوں ہے۔ شعر کی شرح کرنے پر خود معلوم ہوجاتا ہے کہ دونوں جہاں ایک فضول ٹکڑا ہے اور ماہیتوں میں کس قدر بلاغت ہے۔

باہر نہ ہو سکی تو قید خرد سے اپنے　　　اے عقل بے حمیت یہ ہے قصور تیرا

باہر نہ ہو سکی کے بجائے باہر نہ آسکی ہے۔ اور میر درد کی یہی زبان معلوم ہوتی ہے۔ یہ صاف صاف بیرون نیامدی کا ترجمہ ہے

جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف یاں　　　جی میں بھرا ہوا ہے از بس غرور تیرا

مصرع ثانی میں جی میں بھرا ہوا کی بجائے جی میں سما رہا ہے۔ ہے۔ بہ لحاظ معنی یہی زیادہ فصیح اور صحیح ہے اور قلمی۔ ومطبوعہ قدیم۔ اور نسخہ کشوری میں یہی ہے۔ کوئی سبب نہیں کہ سب کے خلاف نظامی پریس کے نسخہ کو صحیح مانا جائے

مدرسہ یا دہر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا　　　ہم بھی مہماں تھے یاں اک تو ہی صاحبخانہ تھا

دوسرے مصرع میں بجائے یاں کے واں ہونا چاہئے۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ ہم کہیں رہے مگر جہاں بھی رہے ہم وہاں مہمان ہی کی حیثیت سے رہے وہاں میزبان تو ہی تھا۔ بجائے اس کے یاں اک کا بے معنی ٹکڑا لگا یا گیا ہے۔ کشوری۔ قلمی۔ اور مطبوعہ قدیم تینوں نسخے ہمارے موافق ہیں۔

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا　　　بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

مصرع اولیٰ میں بجائے دل۔ نسخۂ قدیم میں۔ جی ہے۔ اور سب نسخوں میں دل ہے۔ مگر بجائے دل کے جی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اور قدامت لفظ اسی لفظ کی صحت کی موید ہے۔ درد کے معاصرین نے بھی اکثر بجائے دل کے جی ہی استعمال کیا ہے۔

ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا ہے کعبہ　　　جیدھر پھرے وہ ابرو اودھر نماز کرنا

مصرع ثانی میں جیدھر پھرے کی بجائے جیدھر ہلے ہے۔ سب نسخوں میں یہی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ ابرو پھرنا کوئی معنی نہیں رکھتا ابرو ہلنا بہ معنی اشارہ کرنے کے ہے...... غالباً ہلے۔ صاف نہیں پڑھا گیا۔ اس کی بجاے پھرے بنا دیا گیا

سو بار سوز عشق نے دی آگ پر ہنوز　　　دل وہ کباب تھا کہ جگر خام رہ گیا

مصرع ثانی میں تھا کی بجاے۔ ہے۔ ہے اور بہ نسبت تھا کے یہ زیادہ بامعنی اور صحیح ہے۔ تھا کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب

شاید اس کی وہ حالت نہیں رہی۔

مدت سے وہ تپاک تو موقوف ہو گئے　　اب گاہ گاہ بوسہ پہ پیغام رہ گیا

وہ کی بجائے مصرع اولیٰ میں دے ہے۔ یہی صحیح ہے۔ میر درد کی زبان کا اقتضا یہی ہے۔ اور تپاک کی جمع کے لحاظ سے بھی یہی چاہیے۔ نسخہ قلمی قدیم میں یہی ہے۔

از بسکہ ہم نے حرف دوئی کا اٹھا دیا　　اے درد اپنے وقت میں ابہام رہ گیا

دوسرے مصرع میں۔ ابہام کی بجائے ایہام ہونا چاہیے۔ کیونکہ میر درد کا زمانہ وہ تھا کہ متقدمین کے طریقہ ایہام گوئی کے دور کرنے کی کوشش کیجا رہی تھی۔ ابہام کے کوئی معنی اس جگہ نہیں ہیں اور اس لفظ سے شعر غلط اور مہمل ہو گیا۔

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی　　ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

مصرع اولیٰ میں اِن کی بجائے اون ہے۔ مصحح صاحب نے یہ ستم ظریفی کی ہے کہ اِن کے الف کے نیچے زیر بھی دیدیا ہے۔

اور عاشق مزاج ہے کوئی　　درد کو قصہ مختصر دیکھا

مصرع اولیٰ میں۔ اور بالکل غلط ہے۔ اس کی بجائے زور ہے۔ یہی میر درد کے زمانہ کا محاورہ ہے اور یہاں بھی بامعنی ہے ورنہ شعر مہمل اور غلط ہو جائے گا سب نسخوں میں یہی ہے۔

دشمنی میں سُنا نہ ہووے گا　　جو ہمیں دوستی نے دکھلایا

مصرع اولیٰ میں۔ تیں غلط ہے۔ اس اصلاح نے شعر کو بے معنی کر دیا۔ تیں کی بجائے تے ہے۔ مصحح صاحب کو یہ لفظ بے جوڑ سا معلوم ہوا۔ اور انھوں نے اُسے بدل دیا۔ مگر افسوس ہے کہ انھوں نے دوسرے مصرع کی طرف توجہ نہ فرمائی کہ وہ بے معنی اور مہمل ہوا جاتا ہے۔ مصنف کی غرض اصلی یہ ہے کہ دشمنی اور دوستی۔ دو چیزیں ہیں۔ دشمنی کا کام خرابیاں پیدا کرنا اور دوستی کا کام نشاط و خوشی پیدا کرنا ہے۔ مگر واضح رہے کہ ہمارے ساتھ دوستی نے وہ خرابیاں کی ہیں کہ جو دشمنی سے سنی بھی نہ ہونگی۔ یہی معتبر نسخوں میں ہے۔

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا　　پر اُسے آہ نے اثر نہ کیا

مصرع ثانی میں آہ نے۔ بالکل۔ بے معنی ہے۔ شعر کے مہمل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہی۔ اگر اس کو صحیح مانا جائے تو مصرع اولیٰ بے معنی ہوتا ہے اور کسی طرح چول نہیں بیٹھتی۔ یعنی مصنف کہتا ہے کہ وہ کونسی رات تھی کہ ہم نے نالہ نہ کیا ہو۔ دوسرے میں نالہ کو بھول کر آہ کہتا ہے کہ اس نے اثر نہ کیا حالانکہ نتیجہ کے طور پر کہنا چاہیے تھا کہ نالہ نے اس کو اثر نہ کیا۔ آہ کا یہاں ذکر بیکار تھا۔ نے کے بجائے کچھ ہے سب نسخوں میں یہی ہے اور اسی صورت سے شعر بامعنی ہو سکتا ہے ورنہ دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں رہتا۔

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا　　پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

عہد کے آگے، مصرع ثانی میں اگرچہ صحیح ہے۔ مگر دوسرے نسخوں میں عہد سے آگے ہے۔ اور دلی کی زبان کے بموجب یہی صحیح ہے جیسے مرزا غالب کا یہ شعر ہے:۔

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب — لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

حالانکہ عرش کے پرے ہی اس جگہ کہا جا سکتا تھا۔ مگر سے کہا گیا۔

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن — میں جو ہو نچا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

مصرع ثانی میں ہونچا۔ سراسر ایجاد بندہ ہے جو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غالباً کتابت نے ہوکا دیا ہے اس کی بجائے۔ پوچھا ہے سب نسخوں میں یہی ہے اور یہی صحیح ہے۔ ورنہ مصرع بے معنی ہے اور بامعنی کہنے کے لئے بہت سی تاویلوں کی ضرورت ہے

جوں شمع روتے روتے ہی گزری تمام عمر — تو بھی تو درد داغ جگر کو نہ دھو سکا

دوسرے مصرع میں جگر کو کی بجائے دوسرے نسخوں میں داغ جگر بھی ہے۔ اگرچہ کو بھی غلط نہیں مگر انسب یہی ہے۔

انداز وہ ہی سمجھے مرے دل کی آہ کا — زخمی جو ہو چکا ہو کسی کی نگاہ کا

دوسرے مصرع میں بجائے۔ زخمی جو ہو چکا ہو۔ کے زخمی جو کوئی ہوا ہو۔ تھا۔ جو غالباً ناموزوں سا معلوم ہوا ہوگا۔ اس کی بجائے آج کے مروجہ الفاظ میں زخمی جو ہو چکا ہو بنا دیا گیا۔ حالانکہ میر درد کے زمانہ میں کوئی بروزن فع بھی برابر بے تکلف لکھا جاتا تھا۔

روتا ہے گرم جوشی ہے یاد کرکے درد — آتش نے مجھکو شمع کے مانند تر کیا

مصرع اولیٰ میں روتا ہے کے بجائے روتا ہوں ہے ورنہ غایب اور متکلم کا ناگوار قضیہ پیش آجاتا۔

ٹھہر جا ٹک بات کی بات اے صبا — کوئی دم کو۔ ہم بھی ہوتے ہیں ہوا

دوسرے مصرع میں اگرچہ سب نسخوں میں کو ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی بجائے۔ میں اچھا تھا۔ مطبع نظامی کے نسخہ میں ستم یہ ہے کہ دوسرے مصرع میں ڈیش دیدیا گیا ہے خدا جانے کیا سمجھ کر اچھے خاصے مصرع کو مہمل بنا دیا گیا ہے۔

بلند و پست سب ہموار ہیں اپنی نگاہوں میں — برابر ساز میں ہوتا ہی جوں سُر زیر اور بم کا

مصرع اولیٰ یوں تھا۔ بلند و پست سب ہموار ہیں یاں اپنی نظروں میں۔ مگر زبان کے تدریجی فرق کو مٹا کر اس کو زمانۂ حال کی زبان بنا دیا گیا۔

گلستان جہان کی دید کیجیو چشم عبرت سے — کہ ہر اک سرو قد ہی اس چمن میں نخل ماتم کا

مصرع اولیٰ میں دید مذکر تھا۔ مگر اس کو زمانۂ حال کے موافق مذکر لکھکر زبان پر احسان فرمایا گیا ہے اگرچہ غریب درد کی زبان کا نشان مٹ گیا۔

میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات — پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

اصل میں مصرع اولیٰ یوں تھا۔ میں تو کچھ ظاہر نہ کی تھی دل کی بات۔ میر درد کی زبان یہی ہے۔ مگر اس کو مٹا کر زمانۂ حال کی علامت فاعلیت اس میں رکھدی گئی۔

نگاہ مست ان آنکھوں کی ٹک لے یہ ہر ہے ساقی — کہ ہم کم حوصلہ کے حق میں ہر اک جام ہو شیشا

مصرع ثانی میں بجائے کم حوصلہ کے کم حوصلوں ہے اور بہ لحاظ ہم - وہی صحیح ہے

کہیں لوگوں میں بھلا ہمکو بھی پھرتے چلتے نظر آجائے گا

مصرع اولیٰ اصل میں یوں تھا - کبھو ہم کو بھی بھلا کوچوں میں اُس کو بدل کر مفہوم شعر کو کچھ سے کچھ بلکہ قریب مہمل کے بنادیا۔

نزدیک ہو یہ اپنے بلانیے کب آوے مل جائیگا تو دور سے پہچان ملیگا

چونکہ بُلا بھیجے ایک قدیم اور میر درد کی زبان کا لفظ تھا جواب قریب قریب نہیں بولا جاتا اس کی بجائے بلانے سے بنادیا گیا۔

ملے ہے درد اس کے ساتھ تو دیکھا غربی سے گھمنڈ اس کے جو تھا جی میں سو اب شاید گیا نکلا

اصل میں پہلا مصرع یوں تھا - ملے ہے درد اس کے ساتھ - دیکھا تو غریبی سے - یعنی ہم نے دیکھا تو درد اس کے ساتھ نہایت مسکینت اور غریبی سے ملتا ہے - مگر میں نہیں سمجھتا کہ تو کو دیکھا کیوں پر مقدم کیا گیا۔

گو در اتھا بعد مدت وہ سامنے سے ہوکر اے کوتہی نالہ یہ وقت تھا گئی کا

مصرع ثانی میں قافیہ - گئی - اگرچہ صحیح ہے - قدیم نسخے میں بھی گئی ہے - مگر مطبوعہ کشوری میں کمی ہے - دو وجہوں سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے ایک یہ کہ - گئی - بغیر مصدر کرنے کے مستعمل نہیں - گئی کرنا معنی درگزر کرنا - یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ کوئی شخص انتقام پہ قادر ہو اور رحم کرکے خود درگزر کرے - یہاں بغیر کرنے کے مستعمل ہے - دوسرے حسب تشریح بالا خود درگزر نہیں کی بلکہ کوتہی نے درگزر کی ہے - اس لئے یہ اس کا محل استعمال نہیں ہے - دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ لفظ دہلی کی زبان کا ہے مگر خیال یہ ہے کہ ذوق کے وقت سے پہلے کا نہیں ہے - میر درد کی زبان نہیں ہوسکتی پھر بھی مجھکو اپنے اس خیال پر وثوق نہیں ہے - اگر گئی کہا جائے تو یہ استکراہ مانا جاسکتا ہے

وہ دن کدہر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا یعنی کبھو تو اپنے بھی دل کا دماغ تھا

دوسرے مصرع میں دل کا دماغ ایک عجیب چیز ہے - اصل میں دل تھا، تھا جس کو یوں بنادیا گیا یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر ان سب نسخوں میں جو مصحح کے پاس تھے، یونہی تھا جیسے کہ چھاپا گیا تو وہ سب غلط تھے۔

اس غزل کے بعد رباعیات شروع کردی ہیں - حالانکہ اُن میں ایک بھی رباعی نہیں ہے - دیکھنے والا جلی قلم سے لکھی ہوئی رباعیات کی سرخی دیکھتا ہے اور اُس کو ایک رباعی بھی نظر نہیں آتی - معلوم ہوتا ہے کہ ناتمام غزلوں کے دو دو شعر دیکھ کر انھیں رباعی سمجھ لیا گیا

تشنگی اور بھی بھڑکتی گئی تو جوں جوں میں اپنے آنسوؤں کو پیا

قدیم نسخے میں یوں ہے - جوں جوں میں آنسوؤں کو اپنے پیا - اسی صورت میں خواجہ صاحب کی زبان سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

موج نسیم کو ہے زنجیر بوئے گل کی دامن نہ چھو سکے پر از خود رمیدگاں کا

مصرع اول میں گو کی بجائے گو اور مصرع ثانی میں - چھو سکے کی بجائے - چھو سکی صحیح ہے - اس کے بعد اتراد ردیف الف کا نمبر آتا ہے جسمیں یہ شعر قابل ملاحظہ ہے۔

دیکھ کر حال پریشاں عاشق ناشاد کا یاں کے مستوتوں نے رسم زلف اب ہی ہم اٹھا

پہلے مصرع میں زمانۂ حال کی زبان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اچھی خاصی اصلاح کردی گئی ہے ورنہ مصرع اولیٰ دراصل یوں تھا۔ دیکھکر حال پریشاں عاشقانِ زار کا۔ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ عاشق ناشاد درد کی زبان کا نکلا ہوا فقرہ ہے۔ نہ اس لئے کہ اُس وقت یہ ترکیب رائج نہ تھی بلکہ اس لئے بھی کہ دوسرے مصرع میں معشوقوں جمع کے ساتھ موجود ہے پھر اب لیجئے مصرع ثانی کو جس میں یاں کے۔ ایک بے معنی بات کہی گئی ہے حالانکہ نسخہ مطبوعہ کشوری میں بانکے موجود ہے۔ اور یہی صحیح ہے

فلک پر کون کہتا ہے گزر آہ سحر کرنا　　جہاں جی چاہے وانبر جاکسی دلمیں اثر کرنا

دوسرا مصرع اس قدر مبہم ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ اچھے خاصے صحیح مصرع کو نہ سمجھنے کی وجہ سے زیر و زبر کردیا گیا ہے۔ دراصل یوں تھا۔ جہاں جی چاہے واں جا پر کسی دل میں اثر کرنا۔ یعنی اے آہ تیرے لئے کوئی قید مکانی نہیں لگائی جاتی جہاں تیرا جی چاہے جا مگر جہاں جائے کچھ نہ کچھ کسی دل میں اثر کرنا۔

بے بضاعت ہیں سب اہل زرق برق　　چشمۂ خورشید میں کیدھر ہے آب

زرق۔ برق کے درمیاں میں واؤ کی ضرورت ہے ورنہ ترکیب غلط ہوگی۔ نسخہ قدیم میں یہی ہے۔

موت ہے آسائش افتادگاں　　چشم نقش پا کو مٹ جاتا ہے خواب

مصرع ثانی میں کو بالکل غلط ہے اسی کی بدولت شعر کا شعر مہمل ہوگیا۔ یہاں کا چاہئے۔ ایسا ہی قدیم نسخے میں ہے

ہم روسیاہ دن کو تو کیا منہ دکھا سکیں　　چوں شمع چاہتے ہیں کہ ہو وے شتاب رات

مصرع ثانی میں چوں میں جیم فارسی کی بجائے جیم تازی چاہئے۔ ورنہ قریب قریب غلط ہو جائے گا کیونکہ زبان کے خلاف ہے

زاہد اگر نہیں کی تو نے کسو سے بیعت　　پیر مغاں کہاں۔ کر۔ دست سبو سے بیعت

دوسرا مصرع جس صورت سے بنایا گیا ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اب صحیح مصرع دیکھئے۔ پیر مغاں کے ہاں کر دست سبو سے بیعت یعنی پیر مغاں کے یہاں۔

جائے کسو اسطے اے درد میخانے کے بیچ　　اور ہی مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

نسخہ قدیم میں مصرع اولیٰ میں جائے کی بجائے آئے ہے

سیر باغ بوستاں تو ہے میسر ہر گھڑی　　آئے گا ہے فقیروں کے بھی کاشانے کے بیچ

مصرع اولیٰ میں باغ اور بوستاں کے درمیان سے واؤ غائب کردیا گیا۔ اور مصرع ثانی میں وہ اصلاح ہے کہ سبحان اللہ۔ یعنی فقیروں کے بھی ویرانے کے بیچ کی بجائے کاشانے کے بیچ بنا دیا ہے

چاہے کہ بات جی کی منہ پر نہ میرے آئے　　اپنے دہن کو لاکر رکھدے مرے دہاں پر

قدیم نسخہ میں مصرع اولیٰ میں منہ پر نہ آئے میرے۔ اور مصرع ثانی میں دہن کی بجائے دہاں ہے

ساقی ہی چڑھا آج تو یہ ننگ گھٹا پر　　شیشہ ہو گرے پھینکئے گر سنگ ہوا پر

اس غزل میں ہوا پر ردیف ہے اور سنگ رنگ وغیرہ قافیہ۔ مگر مصحح اور کارکنان کی جدت طبع نے مصرع اولیٰ کی ردیف کو بدلکر گھٹا بنا دیا۔

یاں کرتے ہیں سر کھینچنے کے ڈھنگ ہوا پر مانند جہاں آہ تنگ ظرف جہاں کے

خواجہ میر درد نے پہلے مصرع میں بجائے جہاں کے حباب لکھا تھا۔ سب سے بڑی ستم ظریفی کارکنان و مصحح صاحب نے یہ کی ہے کہ ایک شعر کو نظر انداز کر دیا ہے اور کہیں اس کا ذکر نہیں کیا وہ شعر یہ ہے:۔

اپنی ہی نظر میں یہ بند ہا رنگ ہوا پر تو ہی نہیں ساقی تو جسے ابر میں کھٹے

مہربانی اس قدر نامہربانی اس قدر اس قدر تھا یا کرم یا ظلم رانی اس قدر

پہلے مصرع میں اشارۂ بعید اُس قدر۔ دوسرے مصرع میں بھی اس کے جواب میں بھی اُس قدر تھا۔ مگر جدت طبع نے قریب و بعید سب کو ایک کر دیا۔

دسترس رکھتے تھے کب بہزاد و مانی اسقدر درد تو کرتا ہے معنی کے تئیں صورت پذیر

اس میں بھی بہزاد۔ مانی کے درمیاں سے واؤ عاطفہ اڑا دیا گیا ہے۔ جو دوسرے نسخوں میں موجود ہے۔

بکتا ہوں مثل آئینہ اور ہی جمال کر مشہور خلق میں نہیں اپنے کمال کر

دوسرے مصرع میں ایک نقطہ اڑا کر شعر کو مہمل بنا دیا۔ بجائے بکتا کے بکتا ہونا چاہئے

اس کے بعد ردیف۔ ز ا ہے اس میں بھی مثل سابق رباعیات والی ستم ظریفی کی گئی ہے یعنی جہاں کہیں ناتمام غزل کے دو شعر دیکھے ہیں وہیں رُباعیات لکھدیا یہی رنگ آخر دیوان تک قائم رہا ہے ناواقفان عروض کے لئے سخت گمراہی کا سامان ہے

وابستہ میرے قتل سے تھی آبروئے تیغ لایا نہ تھا جو آج تئیں ہاتھ سوئے تیغ

قدیم نسخے میں مصرع اولیٰ یوں ہے۔ لایا نہ تھا تو آج تلک الخ "

پہونچا صبا کا ہاتھ نہ میری غبار تک راہ عدم میں درد میں اتنا ہوں جلدرو

نسخہ قدیم میں بجائے جلدرو کے تیزرو ہے اور یہی محاورہ ہے

جیسے ناپائدار ہیں ہم پانی پر نقش کب ہے ایسا

قدیم نسخہ میں یوں ہے۔ پانی پر نقش کیا ہے ایسا

ہر جا بے اعتبار ہیں ہم از بسکہ ہیں محولا تعین کو

دوسرے نسخوں میں بجائے بے اعتبار کے بے اختیار ہے جو یقینی معنی کے لحاظ سے زیادہ بلند ہے

اب کی تیرے در سے گر گئے ہم
پھر یہ بھی سمجھ کہ مر گئے ہم

مصرع ثانی میں یہ بھی کی بجائے - یہ ہی ہے - اور پھر کے بجائے بس -

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہوکر چشم تر شبنم
بہار باغ تو یونہی رہی لیکن کدھر شبنم

دوسرے مصرع میں تو کے بجائے - گو - ہونا چاہئے ورنہ شعر بے معنی ہے - رہی کے بجائے رہے ہونا چاہئے -

کیا کہیں سوئے فنا کس طور کر جاتے ہیں ہم
شمع کے مانند سر کے بھل ادھر جاتے ہیں ہم

مصرع ثانی میں بھل لایا گیا ہے - یہ دہلی کی زبان نہیں اس کی بجائے بل ہونا چاہئے

ہمیشہ فتح نصیبی ہمیں نصیب رہی
جو کچھ کہ اپچی ہے جی میں سو ہار رکھتے ہیں

مصرع ثانی میں اپچنا بہ جیم فارسی لکھا گیا ہے لیکن یہ غلط ہے زبان دہلی کے موافق اپجنا چاہئے

جہاں کے باغ سوں ہم دل سوا نہ پھل پایا
فقط یہی ثمر داغدار رکھتے ہیں

مصرع اولیٰ میں سوں لایا گیا ہے - میر درد کے وقت میں یہ متروک ہو گیا تھا - ان کے یہاں جابجا سے - موجود ہے پھر اس محل پر بلاوجہ سوں کا استعمال کیا اور نسخوں میں سے پایا جاتا ہے

چاہے ہے یہ مری تپش دل کہ بعد مرگ
کنج مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

نسخہ قدیم میں مصرع اولیٰ اس طرح ہے - یہ چاہتی ہے تو تپش دل کہ بعد مرگ

کچھ مرتبہ ہے اور وہ فہمید سے پرے
سمجھے ہیں جس کو یار وہ اللہ ہی نہیں

اصل نسخہ میں یوں ہے - کچھ مرتبہ ہے اور ہی - الخ - مصرع ثانی یوں ہے - ہم جس کو بوجھتے ہیں وہ اللہ ہی نہیں - اگر غور کیا جائے تو خواجہ صاحب کی زبان یہی معلوم ہوتی ہے -

انسان کی ذات سے ہی خدائی کے کھیل ہیں
بازی کہاں بساط پہ گر شاہ ہی نہیں

مصرع اولیٰ نسخہ صحیح میں یوں ہے - انسان کی ذات سے ہیں خدائی کے کھیل یاں یہی مصرع درد کی زبان سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے زبان کی تدریجی ترقی پر نگاہ رکھنے والے حضرات خود سمجھ سکتے ہیں

گر کہتے ہو کہ ہے وہی ہادی وہی مضل
تو راہ پر ہیں سب کوئی بیراہ ہی نہیں

میرے نسخہ میں مصرع ثانی میں بجائے بیراہ کے گمراہ ملتا ہے

سبھی اپنے جینے سے اے درد خوش ہیں
اگر ہوں تو یہ ایک بیزار میں ہوں

ہمارے نسخہ میں مصرع ثانی میں اگر کے بجائے مگر ہے اور غالباً صحیح یہی ہے -

یوں تو نظر پڑے ہیں تن انگار سیکڑوں
دلریش کوئی آپ سا دیکھا نہ پر کہیں

مصرع اولیٰ میں بجائے سیکڑوں کے - اور بھی ہے اور یہی زبان کی تدریجی رفتار کے لحاظ سے صحیح ہے

بے زباں ہے یہ وہ زباں سوسن اس چمن میں کسے مجال سخن

اصل میں بے وہ زباں تھا۔ بے کو یہ بنا دیا گیا اور شعر کو مہمل کر دیا۔

ہوے کب وحدت میں کثرت سے خلل جسم و جاں گو دو ہیں باہم ایک ہیں

مصرع ثانی میں بجائے باہم۔ پر ہم تھا۔ اس رد و بدل نے شعر کو بے معنی کر دیا۔ معنی یہ ہیں کہ وحدت میں کثرت سے خلل نہیں آتا ہم میں جسم ہے۔ جان ہے۔ مگر ہم وہی ایک ہیں

دال ہے اسپہ ہی قرآں کا نزول بات کی تہمید میں ہم ایک ہیں

دوسرے مصرع میں بجائے نزول کے نسخہ صحیح میں لفظ وجود ہے

مزاج نازک اگر دل سے کچھ مکدر ہو یہ آئینہ ہم ابھی پاش پاش کرتے ہیں

ہمارے نسخہ میں مصرع اولی یوں ہے۔ مزاج نازک دل سے اگر مکدر ہو

تاقیامت نہیں ٹلنے کا دل عالم سے درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

مصرع اولی میں بجائے ٹلنے کے مٹنا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے۔ کہ درد ہم جاتے ہیں اور اثر چھوڑے جاتے ہیں۔ اب یہ اثر قیامت تک دنیا کے دل سے نہ مٹے گا۔ اس لئے ٹلنا غلط ہے

جس طرف چاہوں چلوں، یہ وہ سرا نہیں ہے وہم کہتا ہے کہ اب پاؤں نہ دھر یاں بھی ہیں

ہمارے نسخہ میں بجائے یہ کے یاں ہے

میں مثل حباب آنکھیں تو رو رو کے بہاؤں پر وہ یہی کہتا ہے سدا جھوٹ ہی ہیں

ہمارے نسخہ میں بہاؤں کی بجائے بہاویں ہے۔ جو صیغہ ماضی ہے اگر یہ نہو تو شعر کا مفہوم صحیح نہیں اور ردیف سے توافق نہیں رہتا

اے درد مجھ سمجھ نہ ان آنکھوں کا بہنا چھاتی کی طرح دل کو مرے کوٹ ہی ہیں

ہمارے نسخہ میں بجائے چھاتی کی طرح کے چھاتی کے تئیں ہے یہاں تئیں بمعنی تک استعمال کیا ہے۔

مجھے در سے اپنے تو ٹالے ہے یہ بتا مجھے تو کہاں نہیں کوئی اور بھی ہیگا ترے سوا تو اگر رہے ہو یہاں نہیں

ہمارے نسخہ میں مصرع ثانی .... اس طرح ہے۔ کوئی اور بھی ہے ترے سوا تو اگر نہیں تو جہاں نہیں۔ بہ لحاظ معنویت بندش اور صحت یہی زیادہ قرین قیاس اور صحیح ہے۔

پرے جوں سایہ ہم تجھ بن ادہر ادہر بھٹکتے ہیں جہاں جائیں قدم رکھیں تو پہلے سر ٹپکتے ہیں

ہمارے نسخہ میں اور نیز کشوری میں مصرع ثانی میں بجائے۔ جائیں۔ چاہیں ہے اور یقینی یہی صحیح ہے۔

گی جس سے عبادت ہو سو وہ زیست کہاں یوں تو کہنے کے لئے کہئے کہ ہاں جیتے ہیں

مصرع ثانی میں ہمارے نسخہ و نیز کشوری میں بجائے کہنے کے لئے کے کہنے کے تئیں ہے

دل تو سمجھائے سمجھتا بھی نہیں
کہئے سودائی تو سودا بھی نہیں

ہمارے یہاں دنیز کشوری میں بجائے سودائی کے مصرع ثانی میں سودا ہے جو سیاق کلام کے زیادہ مناسب ہے

یوں تو سب باتیں نصیحت کی کہیں
پر اثر ہوتا ہے دل کے تئیں کہیں

ہمارے دنیز کشوری نسخہ میں بجائے یوں کے مصرع اولیٰ میں ییں ہے اور یہی صحیح ہے - اس سے آگے پھر وہی رباعیات کی غلط سرخی دیدی گئی ہے - بعد ازاں

دو نگاہیں جو پار ہوتی ہیں
برچھیاں دل کے پار ہوتی ہیں

مصرع اولیٰ میں دو لکھا گیا ہے اور ستم ظریفی یہ کی ہے کہ دو کا ہندسہ بھی اوپر بنا دیا گیا ہے - حالانکہ یہ معلوم ہے کہ ہر جگہ دو نگاہوں کے چار ہونے کا یہ اثر نہیں ہوتا اُس کے بجائے ...... وہ ہونا چاہئے ہمارے یہاں یہی ہے مصرع ثانی میں بجائے برچھیاں دل کے برچھیاں ہیں صحیح ہے -

زلفوں میں تو سدا سے یہ کج ادائیاں ہیں
آنکھوں نے پر اب وہی آنکھیں دکھائیاں ہیں

مصرع ثانی میں بجائے اب کر یہ ہے

ہر دم بتوں کی صورت رکھتا ہے دل نظر میں
ہوتی ہے بت پرستی اب تو خدا کے گھر میں

مصرع ثانی میں بجائے خدا نے - خدا کے ہونا چاہئے - یہ ایک پیش پا افتادہ غلطی ہے

ایسا ہی غم نے تیرے پامال کر دیا ہے
کچھ دل رہا نہ دل میں نہ کچھ جگر جگر میں

مصرع ثانی میں نہ کی کتابت نے کی صورت میں ہونا چاہئے -

کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

مصرع اولیٰ میں اگر کی بجائے ہمارے نسخے دنیز کشوری میں کہ جس ہے

ہووے نہ حول و قوت اگر تیرے درمیاں
جو ہم سے ہو سکے ہے سو ہم سے کبھو نہ ہو

مصرع اولیٰ میں تیرے کی بجائے تیری ہونا چاہئے

جوں صبح چاک سینہ مرا اے رفوگراں
یاں تو کسی کے ہاتھ سے ہرگز رفو نہ ہو

مصرع ثانی میں بجائے سے کے دوسرے نسخے میں بھی ہے

سمجھنا فہم گر کچھ ہے طبیعی سے الٰہی کو
شہادت غیب کی جا ہو تو حاضر ہے گواہی کو

دوسرا مصرع ہمارے نسخے میں یوں ہے - شہادت غیب کی خاطر تو حاضر ہے گواہی کو

نہ رہ جائے کہیں تو زاہدا محروم جنت سے
گنہگاروں میں سمجھا کر یو اپنی بے گناہی کو

دوسرے مصرع میں کر یو کی بجائے کر تو ہمارے نسخہ میں ہے - اس سے مفہوم شعر صاف اور روشن ہو جاتا ہے -

اے درد رفتہ رفتہ کیا آپ کو ہی گم — اس راہ میں چلا تھا میں کس کے سراغ کو

دوسرے مصرع میں بجائے ہی کر بھی اچھا ہے - یہی ہمارے نسخہ میں ہے

اور ہوں آمادہ میخوارگی یہ می پرست — سر اگر کاٹے اُنھوں کے محتسب مثل کدو

دوسرے مصرع میں بجائے اُنھوں کے اُنھوں کا ہے - مگر یہ اختلاف کچھ زیادہ مضر نہیں

بات اہل دید سے کرتے ہیں یاں روشن ضمیر — نت زبان شمع کو ہے چشم ہی سے گفتگو

مصرع ثانی میں ہی سے کی بجائے سے ہی ہے - یہی اہل دہلی کا طرز گفتگو ہے

ملاؤں کسکی آنکھوں سے کہو اس چشم حیراں کو — عیاں جب ہر جگہ دیکھوں کسی کے راز پنہاں کو

مصرع ثانی میں بجائے کسی کے اُسی ہے - اُس میں زبان کی رفتار تدریجی کا ایک خاص فرق ہے جو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں -

اے شور قیامت رہ اُدھر ہی میں کہتا ہوں — چونکے ہے ابھی یاں سے کوئی دل شوریدہ

مصرع ثانی ہمارے نسخہ میں یوں ہے - چونکے نہ ابھی یاں سے کوئی دل شوریدہ - یہی مصرع بامعنی ہے ورنہ اہمال پیدا ہوجاتا ہے

ہر چند سعی میں ہی رہا ناخن ہلال — کھلتی ہے پر سپہر کی کوئی کہن گرہ

مصرع اولیٰ میں ہی رہا کی بجائے ہے سدا ہمارے نسخہ میں ہے - اور اس سے استمراری صورت پیدا ہو گئی جو زیادہ صحیح ہے

ایک ہی جست میں لی منزل مقصود اُسنے — راہرو رشک کی جا ہے سفر پروانہ

مصرع ثانی میں بجائے راہرو واحد کے رہرو جمع ہونا چاہئے - ہمارے اور دوسرے نسخوں میں بھی یہی ہے -

جسپہ تقصیر وار تم سمجھو — ابھی ایسا تو کچھ نہیں ہے گناہ

مصرع اولیٰ میں تم کی بجائے تو ہے

شوخ تو اور بھی ہیں دنیا میں — یہ تیری شوخی کچھ عجب ہے واہ

مصرع ثانی میں بجائے یہ کے پر ہونا چاہئے - اور تیری میں ے کو شامل نہ کرنا چاہئے ورنہ شعر ناموزوں ہو جائیگا

خلوت دل نے کردیا اپنے حواس میں خلل — حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبال گوش ہے

ہمارے و نیز کنجوری نسخے میں بجائے نے مصرع اولیٰ میں میں ہے

ہووے تو درمیاں سے اپنے تئیں اٹھائے — باہر نہیں ہے اور کچھ سر ہی وبال دوش ہے

مصرع اولیٰ صحیح یوں ہے - ہووے تو درمیاں سے آپ اپنے تئیں اٹھائے

ہم نے تو ایک معصیت چاہی چھپے نہ چھپ سکی — اپنے گناہ کو ترا عفو ہی پردہ پوش ہے

ہمارے نسخہ میں تو یوں ہے - ہمنے تو ایک معصیت چاہیں چھپے نہ چھپ سکے -

حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئینہ — یاں تک بھی جس کی آنکھ کھلی ہے سو دنگ ہے

دوسرے مصرع میں تک غلط ہے - ٹک ہونا چاہئے

غنچہ شگفتہ ہووے ہی ہووے کہیں درد　　دیکھا چمن میں جاکے تو کچھ اور رنگ ہے

دوسرے مصرع میں اور رنگ کی بجائے اور ہی رنگ ہے درد کی زبان بھی یہی ہے اور اسی سے یہاں کلام میں زور پیدا ہوتا ہے۔

ابر مژہ چشم تو کیا ہیں کہ گھر کے گھر　　تو نے برس برس کے ہزاروں بہادیے

ہمارے نسخہ میں بہادیے کی بجائے بٹھادیے ہے۔ بہادیے خلاف محاورہ ہے۔ گھر بہنا نہیں بولتے گھر بیٹھنا بولتے ہیں

زاہد کو بتادیجیو بیچو دہیں یہ رنداں　　آتا ہے تو خود داری کو گھر ہی دھر آدی

ہمارے نسخہ میں بجائے آنا۔ آتا ہے

کہتے ہیں کہ یکدست تری تیغ چلی ہے　　تب جانئے جب اک دو قدم چل ادھر آئے

مصرع ثانی یوں ہے۔ تب جانیں کہ جب اک دو قدم چل ادھر آوے

اے صبح رواں تیری مدد ہووے تو شاید　　اس بحر میں ہم سے بھی کوئی شعر تر آوے

مصرع اولیٰ میں صبح رواں بالکل غلط ہے اس کی بجائے طبع رواں ہونا چاہیے

نہیں مشتاق آئینہ کے جو وہ صاف طینت ہیں　　صفا تو عارضی ہے اور کدورت اس میں آتی ہے

مصرع اولیٰ میں بجائے جو وہ۔ وہ جو ہونا چاہیے۔ ورنہ شعر میں اہمال کا اندیشہ ہے

اگر آئینہ چار آئینہ بھرے تو نہیں سنکھ　　سپر ہوں تیر مژگاں کا یہ سو میری ہی چھاتی ہے

مصرع اولیٰ یوں ہے۔ اگر آئینہ چار آئینہ ٹھرے تو نہو سنکھ۔ بھرنا۔ بمعنی پہننا۔ ہندی میں صحیح سہی مگر درد کی زبان نہیں ہے۔ وہ پہننا لکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آئینہ چار آئینہ بھی بنجائے تو بھی اس تیر مژگاں کا مقابل نہیں ہو سکتا۔

کہہ اور بھی غزل کوئی اب اس ردیف میں　　اے درد قافیہ کو اگر تو بدل سکے

ہمارے نسخہ میں اب کی بجائے پر ہے

اخفائے راز عشق ہو آب اشک سے　　یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

اخفائے راز عشق مصرع اولیٰ میں بالکل غلط ہے۔ اس کی بجائے اطفائے نار عشق ہونا چاہیے یہی ہمارے نسخہ اور دیگر نسخہ میں ہے۔

دل ٹکڑے کیا ہے یہ ترا کس کے لبوں نے　　جو لخت ہے سو اشک عقیق یمنی ہے

اگرچہ سب نسخوں میں ترا مصرع اولیٰ میں ہے۔ مگر کوئی معنی نہیں دیتا۔ اغلب ہے کہ مرا ہو۔

آرام سے کبھو ہی نہ یکبار سو گئے　　ایسے ہمارے طالع بیدار سو گئے"

مصرع اولیٰ میں ہی کی بجائے بھی ہونا چاہیے۔

آج نالوں نے مرے اور ہی دلسوزی کی
زخم دل جتنے تھے یاں سب کی جگر دوزی کی

مصرع اولیٰ میں اور ہی کی بجائے زور ہی چاہئے۔ جیسا کہ ہمارے و نیز دوسرے نسخوں میں ہے ورنہ شعر بے معنی سا ہو جائیگا

خیر و شر کو سمجھ کہ دو ہے زہر
سانپ کی زیست ہے تجھے سم ہے

مصرع اولیٰ صحیح نہیں ہے اسکی بجائے ہمارے نسخہ میں یہ ہے۔ خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں دو زہر۔ یعنی خیر بھی ایک زہر ہے اور شر بھی۔ سانپ کا مارنا تیرے نزدیک خیر ہے مگر اُسکے لئے زہر ہے۔ سانپ کی زندگی اس کے لئے خیر ہے تیرے لئے شر ہے۔ لہٰذا دونوں چیزیں اپنے اپنے موقع پر زہر ہیں۔

پاؤں لرزے ہے مست کی مانند
شیشۂ مے ہر آ بلا ہے مجھے

مصرع ثانی ہمارے نسخہ میں یوں ہے۔ شیشۂ مے بھرا ملا ہے مجھے۔ دیکھئے معانی میں کس قدر بلندی پیدا ہوگئی۔ مصرع مطبوعہ نظامی میں۔ بجز تاویل کے معنی صحیح نہیں ٹھہرتے۔

جوں جوں وہ کٹے ہے تو یہی آتی ہے جی میں
پھر چھیڑئے اور باتیں سنا کیجئے اس سے

ہمارے نسخہ میں کھچے۔ بجائے کٹے۔ پایا جاتا ہے۔ مطبوعہ نظامی میں کٹے بمعنی شرمندگی لایا گیا ہے حالانکہ یہ لفظ درد کے وقت میں نہیں تھا جدید ہے۔

صد مرتبہ یوں ہو چکی آپ سے نہ ملئے
وہ بھی تو نہیں بنتی ہے کیا کیجئے اُس سے

مصرع ثانی میں وہ بھی کی بجائے دوں بھی صحیح ہے

گر چاہے تو ملئے اور چاہے نہ ملئے
سب تم سے ہو سکے ہے ممکن نہیں تو ہم سے

مصرع اولیٰ میں اور کی بجائے۔ ور ہے جو (ہور) کا بگڑا ہوا تھا۔

اب ہیں کہاں وہ نالے سرگشتگی کدھر ہے
تھیں یہ باتیں ثابت میرے ہی دم قدم سے

مصرع ثانی میں بجائے یہ اشارہ قریب۔ وہ اشارہ بعید ہے اور یہی ہونا چاہئے

کاہیکو ہوتی تم کو گردش نصیب طالع
گر پاؤں اپنا باہر رکھتے نہ ہم عدم سے

مصرع اولیٰ میں بجائے تم کے ہم ہونا چاہیے۔

پتھر تلے کا ہاتھ ہے غفلت کے ہاتھ دل
سنگ گراں ہوا ہے یہ خواب گراں مجھے

ہمارے نسخہ میں خواب کو مونث لکھا ہے۔ اگرچہ آج کل مذکر مستعمل ہے مگر بہت ممکن ہے کہ درد کے زمانہ میں مونث رہا ہو کیونکہ اس وقت تذکیر و تانیث کی زیادہ پرواہ نہ تھی۔ سیکڑوں الفاظ جو اب مذکر مستعمل ہیں اوس وقت بہ تانیث ملتے ہیں اور مجھے یاد ہے کہ میر درد کے معاصرین کے یہاں بھی میں نے بعض جگہ خواب بہ تانیث دیکھا ہے۔ نیز خیال ہے کہ خود درد کے یہاں بھی دوسری جگہ بہ تانیث ہے

کب ترا دیوانہ آوے قید میں تدبیر سے
جوں صدا نکلا ہی چاہے خانۂ زنجیر سے

دوسرے مصرع میں چاہے کی بجائے جاہے۔ صحیح ہے بمعنی جاتا ہے۔ یہ لفظ سب نسخوں میں بھی یونہی پایا جاتا ہے۔ نیز لمعات اور

مضافات دہلی میں زبان عوام پر ابتک یونہی مستعمل ہے۔

اے ہم وطناں اب کے یہ غیرت زدہ ہرگز
پھرنے کا نہیں عمر کے مانند سفر سے

مصرع اولیٰ میں غیرت زدہ کے بجائے ہمارے نسخہ مطبوعہ قدیم و قلمی میں غربت زدہ ہے۔

کھلتی ہے مری آنکھ جو احوال پر اپنے
جوں شمع گھٹا جاتا ہوں میں اپنی نظر سے

نسخہ قدیم قلمی میں علی الرغم سب نسخوں کے مصرع اولیٰ یوں ہے۔ کھلتی ہے مرے آنکھ جب احوال پر اپنے

گر خاک مری سرمۂ ابصار نہووے
تو کوئی نظر قابل دیدار نہووے

مصرع ثانی میں نسخہ قلمی میں بجائے قابل - مایل ہے۔ جو قابل اعتنا نہیں

سر رشتۂ الفت ہے بڑا شیخ و برہمن
یہ رشتہ بجز سبحہ و زنار نہووے

قدیم نسخہ مطبوعہ میں مصرع ثانی میں بجائے بجز کے بہر ہے - اور قلمی قدیم نسخہ میں یہ رشتہ ہر سبحہ ہے گو مفہوم ان دونوں کا ایک ہی ہے مگر مطبوعہ زیادہ صحیح سمجھا جا سکتا ہے بہرحال بجز ضرور غلط ہے۔

دل ایسے ستمگار سے اظہار محبت
ایسا کہیں پھر دیکھیو زنہار نہ ہووے

مطبوعہ - اور قلمی میں مصرع اولیٰ میں بجائے ایسے کے ویسے ہے۔ یہاں اسم اشارہ غایب صحیح ہے۔ کیونکہ جو کچھ دل کو سمجھایا جا رہا ہے اس ستمگار کی غیبت میں سمجھایا جا رہا ہے نہ کہ مواجہ میں

گر زندگی اس طور سے ای درد جہاں میں
خاطر پہ کسو شخص کے تو بار نہ ہووے

مصرع اولیٰ میں بجائے - گر - کے کر صحیح ہے۔

حال کبھو تو پوچھئے میں جو کہوں سو کیا کہوں
دل ہی سو ریش ریش ہے دل ہی سو داغ داغ ہے

مصرع اولیٰ قلمی و مطبوعہ قدیم نسخوں میں یوں ہے حال مرا نہ پوچھئے الخ یہی صحیح ہے اس حالت میں مہمل ہے

ہائے کس روش بتا ہی بت بیوفا تجھے
عمر گزشتہ کی طرح گم ہی سدا سراغ ہے

نسخہ مطبوعہ قدیم میں مصرع اولیٰ میں ہائے کس روش کی جگہ - ہائے کس جگہ ہے۔ مگر قلمی قدیم میں ہائے کس روش ہی ہے

تیری نگاہ مست نے جب سے نہ کی ہے میکشی
خون سے اپنے مثل گل ہم نے بھرا ایاغ ہے

مصرع اولیٰ میں بجائے نہ کی کے یہ کی ہونا چاہیے۔ یہی دوسرے نسخوں میں ہے۔

پھنسئے کسی کی زلف میں کب یہ ہمیں فراغ ہے
لیجئے بو شمیم سے سو بھی کہاں دماغ ہے

مصرع ثانی میں لیجئے بو شمیم سے بے معنی ہے اس کی بجائے - لیجئے بو شمیم ہی - چاہیے یہی ہمارے قدیم مطبوعہ اور قلمی نسخے میں ہے

بات کچھ دل کی ہمارے تو نہ سلجھی ہے
آپ ہی خوش ہوا پھر آپ ہی گھبراتا ہے

ہمارے نسخہ میں مصرع ثانی اس طرح ہے اور یونہی صحیح ہے۔ آپ ہی خوش ہوتے ہے پھر آپ ہی گھبراتا ہے

راہ بنیڈے کبھو اُس شوخ کے تئیں ہے بھی ‏ ‏ دیدوا دید تو ہوتی ہے جو مل جاتا ہے

راہ بنیڈے سب نسخوں میں ہے۔ مگر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غالباً راہ مینڈے صحیح ہے۔

میں شعر فہم جتنے زمانہ میں لاکلام ‏ ‏ اُسے درد مانتے ہیں یہ سب آن کر مجھے

پہلے مصرع میں بجائے لاکلام کے لاعلاج اور دوسرے میں بجائے آن کر کے مانگر صحیح ہے نسخہ جات قدیم میں یہی ہے

لوگ کہتے ہیں عاشقی جس کو ‏ ‏ میں جو دیکھا بڑی مصیبت ہے

مصرع ثانی میں بجائے میں کے ہم ہے

آنسو نہیں کچھ جگر کے ٹکڑے بھی ہیں بعض بعض ‏ ‏ یہ نہیں معلوم لخت دل کدھر بہکر گئے

نسخہ مطبوعہ قلمی قدیم میں پہلا مصرع اس طرح ہے۔ آنسو نہیں کچھ جگر کے ٹکڑے ہیں بھی بعض بعض۔ دوسرے مصرع میں یہ کی بجائے یہ ہے۔

دل ہی کچھ تنہا خفا ہو کے نہ یاں سے پھر گیا ‏ ‏ ہم بھی تو اے درد چلنے کو مہیا ہو گئے

نسخہ قلمی قدیم و مطبوعہ میں مصرع اولیٰ میں۔ پھر گیا کی بجائے اُٹھ گیا ہے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں ‏ ‏ چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

نسخہ قدیم قلمی و مطبوعہ میں مصرع ثانی میں چشم نم کی جگہ چشم تر پایا جاتا ہے۔ اور بہ لحاظ دامن تر کے وہ زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور صحیح بھی ہے۔

آتش عشق قہر آفت ہے ‏ ‏ ایک بجلی سی آن پڑتی ہے

مصرع ثانی میں بجائے ایک بجلی کے ایک تجلی سی ہے۔ یہ اس لئے صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بجلی کے ساتھ آن پڑنا نہیں بولتے ہیں بلکہ تجلی کے ساتھ بول سکتے ہیں۔

ایسے سے کوئی اپنے تئیں کیوں کہ بچاوے ‏ ‏ دل زلفوں سے بچ جائے تو آنکھوں سے چرائے

مصرع ثانی میں بجائے چرائے کے چھنا لے ہے۔ جو چھینا کا متعدی ہے۔ ہمارے نسخہ میں ہے

یا تو وہ راتیں تھیں یا یہ کچھ دنوں کا پھیر ہے ‏ ‏ ہاتھ اب لگتے نہیں تب پاؤں بو دیا کئے

مصرع اولیٰ میں یا یہ کچھ کی بجائے تو یہ ہے۔

جو یاں کچھ چاہنے والے قریب یک دگر بیٹھے ‏ ‏ ہم اپنا دل بغل میں اب لیکر آہ کر بیٹھے

مصرع اولیٰ میں بجائے کچھ کے دو۔ نسخہ مطبوعہ قدیم میں ہے۔

نہ پوچھو عشق کی سوزش نے عالم میں کیا کیا کیا ‏ ‏ عجب طوفان اٹھائے یہ کہ جس سے گھر کے گھر بیٹھے

مصرع اولیٰ میں بجائے سوزش کے شورش اور مصرع ثانی میں۔ عجیب طوفاں اٹھائے یہ۔ کی بجائے۔ عجب طوفاں اٹھا ہے یہ

صحیح ہے۔ جو نسخہ مطبوعہ قدیم میں ہے۔

دشوار ہوئی ظالم مجھ کو بھی نیند آنی　　لیکن سنی نہ تونے ٹک بھی مری کہانی

مصرع اولی میں ہوئی کی بجائے ہوتی چاہیئے۔ ورنہ شعر ناموزوں ہوگا۔

گر نام عاشقی ترے نزدیک ننگ ہے　　کرنے نہ مجھکو قتل تو پھر کیا درنگ ہے

مصرع ثانی میں کرنے کی بجائے کرے صحیح ہے۔

آیا ہے ابر اور چمن میں بہار ہے　　ساقی شتاب آکہ ترا انتظار ہے

مصرع اول میں اور چمن میں کی بجائے زور چمن میں صحیح ہے۔

بازی بدی تھی اُس نے مری چشم تر کیسا تھ　　آخر کو ہار ہار کے برسات رہ گئی

مصرع اولے میں قلمی نسخے میں اُس نے کے بجائے اون نے ہے یہی میر درد کی زبان ہے۔

گرچہ بیزار تو ہے پر اُسے کچھ پیار بھی ہے　　ساتھ انکار کے پردے میں کچھ اقرار بھی ہے

مصرع ثانی میں کچھ اقرار بھی ہے کی بجائے۔ پھر اقرار بھی ہے۔ قلمی نسخہ میں ہے۔ مگر دونوں مطبوعہ نسخوں میں کچھ ہی ہے

آہوں کی کشمکش میں دیکھو کہیں نہ ٹوٹے　　تار نفس ہے اے دل وابستہ میری جاں ہے

مصرع اولے میں یہ اختلاف ہے۔ آہونکی کشمکش میں کہیں دیکھیو نہ ٹوٹے

دل تڑپتا ہے درد پہلو ہے　　جی نکل جائیو کہ قابو ہے

مصرع ثانی نسخہ مطبوعہ قدیم و قلمی میں اس طرح ہے مرگ آ پہونچیو کہ قابو ہے

نہیں چھوڑتی قید ہستی مجھے　　اگر کھینچ لیجائے مستی مجھے

مصرع ثانی میں اگر کی بجائے مگر چاہیئے

گلرخاں کا بحر و بر میں جو کہ ہے مدہوش ہے　　ہمنے دریا میں بھی دیکھا بلبلوں کا جوش ہے

گلرخاں کی بجائے قدیم قلمی اور مطبوعہ نسخے میں۔ گلرخوں ہے

یارب پھر اتنی تو اب در گزر کرے　　یہ خانماں خراب کسی دل میں گھر کرے

مصرع ثانی مطبوعہ قدیم و قلمی میں اس طرح ہے کوئی خانماں خراب کسی دل میں گھر کرے چونکہ کوئی ناموزوں سا معلوم ہوتا تھا اس کی بجائے یہ بنایا گیا۔ حالانکہ کوئی بروزن فع قدما میں مستعمل تھا۔

نہ مرتے ہیں نہ نیند آتی نہ وہ صورت بسرتی ہے　　یہ جیتے جاگتے ہم پر قیامت سب گزرتی ہے

مصرع ثانی میں سب کی بجائے شب صحیح ہے

نالہ ہے سو بے اثر اور آہ بے تاثیر ہے　　سنگدل کیا تجھکو کہئے اپنی ہی تقصیر ہے

مصرع ثانی میں تقدیر کی بجائے تقصیر صحیح ہے یہی قدیمی مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں ہے

اُس کے بعد رباعیات شروع ہوتی ہیں، جو واقعی رباعیاں ہیں۔ اُن پر یہ سرخیاں دیگئی ہے۔ رباعیات متفرق۔ حالانکہ دیوان درد میں رباعیاں صرف یہی ہیں۔ پہلی رباعی کا دوسرا شعر یہ ہے۔

اب موندے آنکھ بس جہاں کو دیکھا   جوں آئینہ کب تلک، پریشاں نظری کو

موندے کی بجائے موندئے صحیح ہے۔ ایک رباعی کا شعر آخر یہ ہے

جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا ہم نے   بینائی نہ تھی تو دیکھتے تھے سب کو

مصرع اولیٰ میں سب کو غلط ہے اس کی بجائے قلمی۔ و مطبوعہ قدیم میں سب کچھ ہے۔

بندہ بندہ خدا خدا کہتا ہوں کو   ملا کو بھی کچھ اس میں نہیں ہو انکار

پہلا مصرع قدیم قلمی۔ و مطبوعہ قدیم میں یوں ہے۔ ملا کو بھی اس میں نہیں جائے انکار۔ ترکیب بند کا ایک یہ شعر ہے۔

ہے پردہ چشم سرگیں تو   تو ہی تو ہے دل کی بے حجابی

سرگیں غلط ہے اس کی بجائے شرگیں صحیح ہے قدیم نسخوں میں یہی ہے ورنہ شعر مہمل ہو جائے گا۔

تو مجھکو بتا کہیں چھپا ہے   ظاہر ہے تجھی سے تو یہ عالم

مصرع ثانی میں کہیں کے بجائے کہاں ہے

ہمسے ہے مگر ارادۂ جنگ   کرتا ہے تو صلح غیر سے تو

مصرع اولیٰ میں تو اول کی بجائے جو صحیح ہے۔ قلمی نسخے میں بھی یہی ہے

ہے نے سے زیادہ تر خوش آہنگ   کرتا ہے یہ دل تو روز نالے

مصرع اولےٰ میں روز نالے غلط ہے۔ زور نالے ہونا چاہیے۔

اس قدر مطالعہ کے بعد ہر شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ نظامی پریس نے دیوان درد کی طباعت میں جسقدر ظاہری زینت سے کام لیا ہے اسیقدر اسکی صحت کیطرف سے بے اعتنائی اختیار کی گئی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کہیں کہیں صلاح مناسب ہے، تو بھی اس کا کیا جواب ہے کہ نظامی پریس یا معین الدین صاحب یا اور کسی کو کیا حق حاصل تھا کہ وہ درد کے اسلوب بیان اور اس کے زبان کو بدل کر اپنے زمانہ کی پیداوار بنا دیں۔ جہاں تک ہم نے غور کیا حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ نواب صدر یار جنگ نے معین الدین صاحب پر اعتماد کر لیا اور خود ایک لمحہ کے لئے بھی یہ تکلیف گوارا نہیں کی کہ وہ دیوان کو ملاحظہ فرماتے نواب صدر یار جنگ نے مقدمہ نہایت پاکیزہ لکھا ہے لیکن ایسے دیوان پر جو درد کا کم اور معین الدین صاحب کا زیادہ ہے، اسی طرح نظامی پریس سے یہ الزام دور نہیں ہو سکتا کہ اُس نے صرف طباعت ہی کو اپنا فرض سمجھا اور بہ حیثیت ایک ذی ہوش ناشر کے کوئی جستجو اس امر کی نہیں کی کہ جس چیز کو وہ اس قدر اہتمام و طنطنہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، وہ حقیقتاً اس قابل ہے بھی یا نہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ حقیقت کے لحاظ سے ساری ذمہ داری معین الدین صاحب پر عاید ہوتی ہے جنھوں نے اپنے فرائض کا صحیح احساس نہ کر کے اس اعتماد کو مجروح کیا جو ان پر قائم کیا گیا تھا لیکن مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی مشکل سے اس الزام سے بری ہو سکتے ہیں کہ کیوں انھوں نے بغیر خود دیکھے ہوے محض اعتماد پر توثیق صحت فرما دی اور نظامی پریس کے مالک کسی طرح اس اعتراض کو رفع نہیں کر سکتے کہ انھوں نے کیوں نہ قبل اشاعت خود صحت کی تحقیق کی۔ اس لئے اب اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ صدر یار جنگ اپنے دیکھنے اور معین الدین صاحب کی غلطیوں کا اعتراف فرمائیں اور نظامی پریس اس اشاعت کی تمام کاپیوں کو تلف کر

"قطرۂ آتشیں"

(فسانہ)

گزشتہ قرن کے اخیر میں سرزمین ہنگری نے دو بھائی کاردلی کسوالڈی اور الگزنڈر ایسے پیدا کئے جن پر وہاں کے ادبیات کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ کاردلی ہر چند خصوصیت کے ساتھ اپنی روایات تمثیلی کی وجہ سے بہت مشہور ہوا، لیکن اس نے اپنی مختصر زندگی میں جو ہمیشہ خطرات سے گھری رہی — بعض ایسے عجیب و غریب فسانے بھی لکھے جن پر ہنگاری ادب جس قدر فخر کرے کم ہے۔

آج کی صحبت میں اسی کے ایک افسانہ کا ترجمہ (جسے میں نے عربی سے لیا ہے) درج کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ جب ایک ماہر افسانہ نویس کسی ایک واقعہ میں مرکزیت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے وہ کس قدر اہتمام کرتا ہے اور کس طرح ماحول کو آہستہ آہستہ سمیٹ کر اس مرکز میں جذب کر دیتا ہے جسے اس نے ہدف خیال بنایا تھا۔ مصنف نے اس قصہ کا عنوان پوشیدہ زخم رکھا تھا میں نے اُسے "قطرۂ آتشیں" سے بدل دیا ہے

نیاز فتحپوری

ایک دن طلوع آفتاب سے قبل، بہت سویرے ایک شخص ایک مشہور ڈاکٹر کے پاس آیا اس حال میں کہ وہ ابھی تک بیدار نہ ہوا تھا روازہ پر پہونچکر اُس نے ڈاکٹر صاحب کے خادم سے التجا کی کہ "اپنے آقا کو جگا دو کیونکہ میں نہایت ہی سخت مرض لیکر آیا ہوں اور یرا اسی وقت عمل جراحی ہونا چاہئے"۔

جب ڈاکٹر جاگا اور اس کو ایسی شدید ضرورت کا علم ہوا تو اس نے فوراً کپڑے پہنے اور خادم کو حکم دیا کہ آنے والے کو اندر بھیجدے نووارد کے خدوخال وضع و لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت بلند طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کے چہرہ کی زردی صاب کے ہیجان سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کو کوئی شدید تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ اس کا داہنا ہات بندھا ہوا تھا اور گلے میں ک رومال ڈالکر اسپر اُسے سہارا دیکر لٹکا لیا تھا۔ اور باوجودیکہ وہ حد درجہ صبر و ضبط سے کام لے رہا تھا لیکن پھر بھی اس کی بے چین کراہ کبھی ی نکل ہی جاتی تھی۔

ڈاکٹر نے نہایت عزت و احترام سے اس کا استقبال کیا اور بولا کہ "تشریف رکھئے اور فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں"

— "ایک ہفتہ سے میرے ہاتھ میں اس قدر شدید درد ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی پلک نہیں جھپکا سکا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ درد سرطان

کی وجہ سے ہے یا کسی اور بیماری کی وجہ سے پہلے ہلکا ہلکا قابل برداشت تھا۔ لیکن اب یہ عالم ہے کہ اُسکی برداشت ممکن ہی نہیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ وہ ہر ساعت بڑھتا جاتا ہے اور اُسی کے ساتھ کرب و ایذا کا عذاب بھی مجھے ہلاک کئے ڈالتا ہے۔ اِس لئے خدا کے لئے کوئی تدبیر کیجئے، میرا ہاتھ کاٹ ڈالئے آگ سے داغ دیجئے، بہر حال جو کچھ کرنا ہو جلد کیجئے۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا، اگر جان نہ نکلی"

ڈاکٹر نے اُسے تسکین دی اور کہا کہ "یہ مرض ایسا سخت نہیں ہے اور جراحی کی ضرورت نہ ہوگی، آپ مطمئن رہیں"

——— نہیں نہیں، جراحی کی ضرورت یقیناً ہوگی اور میں آپ کے پاس اسی لئے آیا ہوں کہ آپ میرا ہاتھ کاٹ ڈالئے تاکہ اس عذاب نجات مل جائے" یہ کہتے ہوئے اُس نے رومال سے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور اُس کو اٹھا کر بولا۔ آپ کو غالباً یہ دیکھکر تعجب ہوگا کہ ہاتھ میں بظاہر کوئی زخم یا درد کا سبب موجود نہیں ہے۔ مگر میرا مرض ہی قیاس سے باہر ہے مگر اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل عجیب و غریب"

ڈاکٹر نے نہایت غور سے اس کے ہاتھ کو دیکھا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس میں کوئی علامت کسی مرض کی نہ تھی اور بائیں ہاتھ کی طرح وہ بھی بالکل صحیح تھا اس نے دریافت کیا کہ "درد کس جگہ محسوس ہوتا ہے؟"۔ اس نے اپنا ہاتھ ڈاکٹر کی طرف بڑھایا اور دونوں وریدوں کے درمیان انگلی کے اشارہ سے ایک جگہ کو متعین کیا۔ ڈاکٹر نے حد درجہ نرمی سے اس جگہ کو چھوا لیکن وہ اس کی بھی تاب نہ لا سکا اور درد کی شدت سے چیخ اُٹھا

ڈاکٹر نے کہا "سخت حیرت ہے کہ مجھے آپ کے ہاتھ میں کسی مرض کا ہونا معلوم نہیں ہوتا"

——— "لیکن میں درد سے تڑپ رہا ہوں"

ڈاکٹر نے خوردبین اُٹھا کر اس سے اس کے ہاتھ کا نہایت غور سے معائنہ کیا، تھرمامیٹر سے اُس کا درجۂ حرارت دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولا کہ جلد اور شرائین بہترین حالت میں ہیں۔ ورم و التہاب کا کوئی نشان نہیں ہے اور ہاتھ ہر مرض سے پاک ہے"

——— "لیکن اس حصۂ جسم میں جہاں درد ہے سرخی تو معلوم ہوتی ہے"

——— "کہاں ہے"

اس نے ایک گول چھوٹا سا دائرہ انگلی سے بتاتے ہوئے کہا کہ "اِس جگہ"

ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس شخص کو اگر کوئی بیماری ہے تو عقل کی خرابی کی ہے اس لئے اس نے کچھ تامل کر کے جواب دیا کہ کہ آپ کچھ دن شہر میں قیام کریں میں علاج میں اپنی پوری کوشش صرف کر دونگا"

——— "میں تو ایک لمحہ کا انتظار نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے دیوانہ سمجھئے اور نشتر نکال کر اتنا حصہ گوشت کا اور جی چاہے تو ہڈی بھی نکالکر پھینک دیجئے"

——— "میں تو یہ نہیں کر سکتا"

——— "کیوں؟"

——— "اس لئے کہ آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح صحیح و سالم ہے اور اس میں جراحی کی ضرورت نہیں"

یہ سنکر اس آدمی نے اپنی جیب سے ہزار روپیہ کا نوٹ نکالا اور سامنے میز پر رکھ کر بولا کہ آپ مجھے شاید دیوانہ سمجھتے ہیں لیکن میں کامل صحت عقل کی حالت میں ہوں آپ عمل جراحی کے لئے آمادہ ہوں تو یہ حقیر ہدیہ پیش کرنے کے لئے لیا ہوں"

میں عضو صحیح میں نشتر کا استعمال نہیں کر سکتا خواہ دولت قارون ہی کیوں نہ ملے"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ یہ میرے ضمیر اور میرے پیشہ کے آداب کے خلاف ہے"

اچھا تو پھر میں ہی خود عمل جراحی کرونگا" ہر چند میرا بایاں ہاتھ اچھی طرح کام نہ دیگا۔ لیکن آپ یہ تو کرینگے کہ جب میں گوشت کا دردمند حصہ کاٹ ڈالوں تو زخم کا علاج آپ کریں" یہ کہکر اُس نے فوراً اپنی آستین چڑہائی اور قبل اس کے ڈاکٹر روکے جیب سے چاقو نکال کر ہاتھ میں تیر ادیا۔ ڈاکٹر نے یہ دیکھ کر کہ کہیں کوئی ورید یا شریان نہ کٹ جائے، فوراً چیخ کر کہا کہ "ٹھہر جائے اگر آپ کو ایسا ہی اصرار ہے تو میں اس عمل کو پورا کئے دیتا ہوں" یہ کہکر اس نے اپنی آستین چڑہائی اور کہا کہ اپنا منہ پھیر لیجئے اس خیال سے کہ خون بہتا ہوا دیکھ کر متاثر نہ ہو، لیکن اُس نے کہا کہ "اس کی ضرورت نہیں۔ بلکہ مجھے دیکھتے رہنا چاہئے۔ تاکہ میں صحیح جگہ آپ کو بتا سکوں"

ڈاکٹر نے اپنا عمل شرع کیا۔ اور وہ نہایت اطمینان سے بغیر کسی خوف و ہراس، یا لرزہ وارتعاش کے اُس کو برداشت کرتا رہا جب ڈاکٹر گوشت کا اتنا حصہ کاٹ چکا تو مریض نے نہایت اطمینان کی سانس لی" ڈاکٹر نے دریافت کیا" اب تو کوئی درد محسوس نہیں ہوتا"

اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ "نہیں" لیکن ذرا سی ٹیس زخم کی ہے، اب تو خون کو آزادی کے ساتھ بہہ جانے دیجئے تاکہ پھر کوئی خلش باقی نہ رہے۔

ڈاکٹر نے زخم پر پٹی باندھی اور مریض نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے ہوٹل کا پتہ بتا کر واپس گیا۔ ڈاکٹر روز وہاں جاتا اور پٹی بدل کر چلا آتا۔ چند دن میں زخم بالکل اچھا ہو گیا اور وہ اپنے وطن چلا گیا۔

—(۲)—

گزشتہ واقعہ کو تین ہفتہ کا زمانہ گزرا ہوگا کہ وہی شخص پھر واپس آیا اس حال میں کہ اس کا ہاتھ پھر رومال میں لٹکا ہوا تھا اور اسی مقام پر کرب والم کی وہی شکایت اس کی زبان پر تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور سرد پسینہ اس کی پیشانی پر ٹپک رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھکر اُس نے اپنا ہاتھ ڈاکٹر کے سامنے بڑھایا اور بولا کہ معلوم ہوتا ہے آپ نے کافی گہرائی تک جا کر جراحی نہیں کی اور اسی لئے درد پھر عود کر آیا اور اسی شدت کے ساتھ۔ مہربانی کرکے پھر عمل جراحی کیجئے۔ لیکن مکمل طور پر"

ڈاکٹر نے اس جگہ کو دیکھا جہاں اس کے پہلے عمل جراحی کیا تھا۔۔۔۔ پھر کوئی علامت موجود نہ تھی، نئی جلد پیدا ہو کر تمام وریدیں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں نبض بھی اعتدال کے ساتھ چل رہی تھی۔ تپ کی بھی کوئی علامت نہ تھی، لیکن وہ شخص درد کی وجہ سے کانپا جا رہا تھا

ڈاکٹر نے مجبوراً پھر شگاف دیا اور پھر اس کا درد دور ہوگیا۔ لیکن جب وہ جانے لگا تو ایک حزن و ملال کے ساتھ بولا کہ تعجب نہ کرنا اگر میں پھر ایک مہینے کے بعد واپس آؤں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ "آپ یہ خیال دل سے نکال ڈالئے، اللہ نے چاہا تو اب مرض کا اعادہ نہ ہوگا" اُس نے کہا کہ مجھے تو اس کا ایسا ہی یقین ہے جیسے خدا کے وجود کا، لیکن خیر دیکھا جائیگا"

جب وہ ... چلا گیا تو ڈاکٹر نے اس واقعہ کا ذکر اپنے اور ہم پیشہ احباب سے بھی کیا لیکن کوئی تشخیص نہ کرسکا۔

(۳)

ایک مہینہ گزر گیا اور وہ شخص واپس نہ آیا۔ اس کے بعد بھی کئی ہفتے گزر گئے یہاں تک کہ ڈاکٹر اس واقعہ کو بھول گیا ایک دن اتفاق سے اُسکا ایک خط ملا جس کا مضمون یہ تھا:۔

میرے عزیز دوست۔

میں آپ کو زیادہ عرصہ تک حیرت میں مبتلا رکھنا مناسب نہیں سمجھتا اور نہ اس راز کو اپنے ساتھ قبر میں لیجانا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ درد نے پھر تیسری مرتبہ عود کیا اور میں نے نہایت تیز دہکتا ہوا انگارہ رکھدیا۔ اب میں اس قابل ہوا ہوں کہ ہاتھ کو حرکت دے سکوں اور یہ خط آپ کو لکھتا ہوں

کچھ زمانہ ہوا کہ میں اپنے کو بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا اور تھا بھی ایسا ہی کیونکہ نشاط زندگی کے لئے جتنے اسباب کی ضرورت ہے وہ سب مہیا تھے۔ میں نے ایک ایسی خاتون سے شادی کی جو حسن و جمال اور سلیقہ و تہذیب کے لحاظ سے عدیم المثال تھی۔ یہاں مجھے بتا دینا چاہئے کہ شادی سے قبل میری بیوی کی دوست ایک اور خاتون بھی تھی جو نہایت ذی عزت اور دولتمند تھی۔

شادی کے بعد چھ مہینے جس لطف و مسرت سے بسر ہوے اس کا بیان محال ہے، ہر نیا دن گویا محبت و خلوص کا ایک نیا دروازہ تھا اور زندگی کا ہر لمحہ ولولہ و شوق کی پر لطف داستان۔ جب میں کسی ضرورت سے شہر جاتا تو واپسی کے وقت وہ دور تک پیدل چلکر میرا خیر مقدم کرتی اور یہ معلوم ہوتا کہ وہ میری روح کے ساتھ جی رہی ہے۔

اسی لطف و مسرت کی زندگی میں دفعتہً یہ خطرہ میرے دل میں پیدا ہوا اور خدا جانے کیوں، کہ اس کی تمام باتیں تکلف و تصنع ہیں۔ میری بیوی کے پاس ایک سینے پرونے کی میز تھی اور اس میز میں ایک خانہ تھا جس کو وہ ہمیشہ مقفل رکھتی۔ نہایت احتیاط سے اس کو بند کرتی اور کنجی اپنے پاس رکھ لیتی۔ اس بات سے میرے دل میں شکوک پیدا ہوئے اور رفتہ رفتہ ان میں اس قدر استحکام پیدا ہوگیا کہ مجھے اس کی تمام محبت جھوٹی اور جملہ عنایتیں مکر و فریب نظر آنے لگیں، میں بیتاب تھا کہ کسی طرح اس خانہ کو کھول کر دیکھوں کہ اس کے اندر کیا ہے جس کی وہ اس قدر اہتمام کے ساتھ حفاظت کرتی ہے۔

ایک دن وہی خاتون جو میری بیوی کی دوست تھی آئی اور میری بیوی کو اپنے ساتھ لے گئی، مجھ سے بھی اصرار کیا لیکن میں نے کہا کہ بعد دوپہر آؤنگا اُن کے جانے کے بعد میں فوراً میز کے قریب گیا اور کسی نہ کسی طرح اس خانہ کو کھولا جو مقفل رہتا تھا۔ اس کے اندر منجملہ اور اشیاء کے ایک بنڈل نفشئی رنگ کے ڈورے سے بندھا ہوا ملا۔ میرا دل دیکھتے ہی دھڑکا تھا، لیکن جب میں نے اُسے کھولا تو میرا شک یقین

ے بدل گیا کیونکہ یہ عشقیہ خطوط کا بنڈل تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے انھیں پڑھا اور اب میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کیا لکھا تھا اور کس طرح اُنھیں پڑھ رہا تھا، یہ میرے ایک دوست کے خطوط تھے اور اس زمانہ کے تھے جب میری شادی ہو چکی تھی۔ میں نے پھر خانہ کے اندر ان کو رکھا اور قفل لگا دیا۔

جب شام کو میری بیوی واپس آئی تو حسب عادت اسی شوق و ولولہ کے ساتھ ملی جو روز اس سے ظاہر ہوتے تھے میں نے ضبط سے کام لیا اور اسپر اپنے تاثر کو بالکل ظاہر نہ ہونے دیا۔ ہم دونوں نے ساتھ کھانا کھایا، کھانے کے بعد کچھ وقت حسب معمول باتوں میں صرف کیا اور پھر اپنے اپنے کمرہ میں آرام کی غرض سے چلے گئے میں اس وقت بالکل دیوانہ تھا، دماغ کی یہ حالت تھی جیسے کوئی سیسہ پگھلا کر اندر ڈال رہا ہے۔ جب آدھی رات ہوئی تو میں اُٹھا اور دبے قدموں اس کی مسہری تک پہونچا۔ وہ غافل سو رہی تھی اور اس کے چہرہ سے پورا اطمینان وسکون ظاہر تھا۔ اُس کے چہرہ کے اس سکون کو دیکھ کر میری دیوانگی میں اور اضافہ ہوا اور میں نے اپنا داہنا ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی۔ یہ میری گرفت ایسی آہنی گرفت تھی کہ ایک مرتبہ آنکھ کھول کر مجھے دیکھ تو لیا لیکن اُسنے نہ کوئی آواز نکالی نہ ہاتھ پاؤں مارے، معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت سکون کے ساتھ اس موت کو برداشت کر رہی ہے، تھوڑی دیر میں اُس کا دم نکل گیا۔ اور کوئی علامت ایسی ظاہر نہ ہو سکی جس سے کسی کو قتل کا شبہ ہو سکتا، البتہ جب گلا دبانے سے اس کا منہ زیادہ کھلا تو اس سے خون کا ایک قطرہ نکل کر میرے داہنے ہاتھ کے اُس حصہ پر پڑ گیا جس سے آپ خوب واقف ہیں۔ لیکن اس کا علم بھی مجھے صبح کو ہوا۔

دوسرے دن جب اسے دفن کر کے میں گھر واپس آیا تو وہی خاتون (جو میری بیوی کی دوست تھی) گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی اور کلمات تعزیت استعمال کرنے کے بعد بولی کہ "میں اس وقت ایک خاص غرض سے آئی ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میری مدد کریں گے"۔ میں نے کہا کہ فرمائیے اُس نے جواب دیا کہ "آپ کی بیوی کے پاس میرے کچھ خطوط امانتاً جمع تھے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کیا آپ مجھے واپس دیں گے"۔ میں نہیں بیان کرونگا کہ یہ سنکر میرا کیا حال ہوا، اگر وہ خاتون سامنے نہ ہوتی تو شاید میں چاقو سے اپنے دل کو نکال کر پھینک دیتا، دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دیدیتا۔ بہر حال میں نے حد درجہ صبر و ضبط سے کام لیا اور خطوط کا وہ بنڈل نکال کر میں نے خاتون کے حوالہ کیا۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد ٹھیک اُسی جگہ جہاں قطرۂ خون گرا تھا جلن محسوس ہوئی اور اس میں رفتہ رفتہ وہ شدت پیدا ہوئی جس کا علم آپ کو بھی ہے۔ بہر حال چونکہ وہ میرے جرم کی سزا ہے اس لئے میں اُسے برداشت کرونگا اور اس کا مداوا نہ چاہوں گا۔ علاوہ اس کے اب یوں بھی کوئی ضرورت اس کے دفع کرنے کی نہ ہوگی۔ کیونکہ میں بہت جلد اس کے پاس پہونچنے والا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ میرے اس قصور کو معاف کر دے اور ہم دونوں پھر اسی کھوئی ہوئی محبت کی فضا میں روحانی زندگی بسر کر سکیں"۔

نیاز فتحپوری

ملکہ نرگس بیگم

نظر غور سے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت کچھ فایدہ بخش نتائج نکل سکتے ہیں، فی الحقیقت تذکرہ رفتگاں ہمارے لئے مرقع عبرت ہے نہ صرف بعض اوقات حیرت و خوشی، اور درد و بیتابی کی ایک مجموعی کیفیت دل پر طاری ہوتی ہے۔ بلکہ یہی اوراق تاریخ نوع انسانی کی بداقبالیوں اور خوش حالیوں، اور امم ماضیہ کے انقلاب آمیز واقعات ہمارے پیش نظر کر دیتے ہیں اور ہم درس عبرت کا مطالعہ کرتے ہوئے اصول ”خذ ما صفا ودع ما کدر“ کو پیش نظر رکھکر تجربے حاصل کر سکتے ہیں ؎

ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

موسیو گسٹو لیبان مصنف تمدن ہند لکھتا ہے۔ ”مصنفین اسلام کا ہمیں بہت مشکور ہونا چاہیے کہ اس زمانہ کی تاریخ اسقدر صاف اور واضح ہے جسقدر اس کے ماقبل ازمنہ کی تاریخ تیرہ و تاریک ہے“

یہ ہمارے لئے باعث افتخار ہے کہ ہمارے اسلاف نے واقعات کو کتب تواریخ میں مدون کر کے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا تاکہ آئندہ نسلیں بہ غور مطالعہ کریں، اور اصلاح عمل کے ساتھ آفتاب تاریخ کی ہدایت کرنے والی نورانی شعاعوں سے استفادہ...... کریں نہ صرف ہم کو اس سے کاروبار، معاشرت، اور دنیوی معاملات میں مدد ملتی ہے بلکہ دیانت و صداقت، نیک کرداری و حسن تدابیر، شجاعت و دلیری، خلوص و راست بازی کے متحیر کرنے والے واقعات ہماری قوت تخیل میں تحریک پیدا کر کے ہمکو عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

فن تاریخ بصیرت انسانی کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور اسکا مطالعہ خیالات میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور جذبات میں تلاطم، انسان کی تخلیق کی غایت یہ ہے کہ وہ دنیا میں پیدا ہو تو ایسے کام کرے جن کی وجہ سے اس کا نام اس کے بعد بھی زندہ رہے اور مشیت ایزدی کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ انسان اس جوہر سے جو خدائے پاک نے اس کی ہستی میں ودیعت کیا ہے کام لے اور نشو و نما کے ساتھ ساتھ محیر العقول کارنامے چھوڑ جائے۔ جب ہم اپنے اسلاف کی زندگی کے حالات پر بالاستیعاب نگاہ تنقید ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں سے بعض ایسی گزر چکی ہیں جن کو لوگ قیامت تک یاد کریں گے، اور جن کی برکات یادگاری سوانح ہزاروں برس تک دلوں میں احساس پیدا کرتی رہینگی۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں میں تعلیم اس درجہ عام تھی کہ ادنی سے ادنی پیشے والے بھی اس سے محروم نہ رہتے تھے۔ لیکن تغیر زمانہ کے ساتھ اب مسلمان علم سے اس قدر نا آشنا ہیں، گو آج کل تعلیم یافتہ خواتین بہت کم نظر آتی ہیں اور تعلیم نسواں کا خیال ایک خواب سا ہے تاہم ازمنہ گزشتہ کی تاریخ اور اس زمانہ کی تصنیفات ہم کو یہ بات بتلاتی ہیں کہ اس زمانہ میں مسلمان عورتوں کی تعلیم ضروری خیال کی جاتی تھی۔ اور تمام بڑے بڑے گھرانوں میں اسکا بخوبی چرچا تھا، خاندانی شرافت کیساتھ یہ جوہر لازمی ہو گیا تھا اور انہیں خواتین نے

ایسے محیر العقول کارنامے چھوڑے ہیں جو ہمارے لئے مواعظ و عبرت کے زریں درس ہیں، شہنشاہ بابر کی بیٹی "شہزادی گلبدن بیگم" نہ صرف تعلیم یافتہ تھی بلکہ اس نے ایک ایسی کار آمد کتاب "ہمایوں نامہ" تصنیف کی جو تاریخی حیثیت سے آج بھی مستند سمجھی جاتی ہے، جہانگیر کی رحلت کے وقت اس کی عزیز بیوی ملکہ نور جہاں بیگم نے جو نظم لکھی سچ تو یہ ہے کہ قابل عورتوں کی لیاقت کا بہترین نمونہ ہے۔ شہزادی زیب النساء کی نکتہ سنجی اور شاعرانہ طبیعت ضرب المثل ہے جو محتاج بیان نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں دیکھتے ہیں جو اس امر کی بخوبی وضاحت کرتی ہیں کہ عورتوں نے انتظام امور مملکت میں بہت حصہ لیا اور اپنے عزیز شوہر کے دوش بدوش امور سلطنت کی انجام دہی میں منہمک رہیں،

آج ہم سرزمین دکن کی عفت ماب، مدبر، اور دور اندیش شہزادی نرگس بیگم کے حالات زندگی کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، یہ وہ ملکہ ہے جس کی سوانح دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبقہ اناث میں بھی بعض بعض بیگمات دلیری، عزم ثبات، جہانبانی، اصابت رائے، اور تدبر میں مردوں سے کم نہیں رہیں ؛

ہمایوں شاہ بہمنی سلاطین بہمنیہ میں نہایت ہی تند مزاج، سفاک اور ظالم و جابر بادشاہ گزرا ہے تخت نشینی سے وفات تک یہ بادشاہ قتل و خونریزی میں مصروف رہا جس کی وجہ سے تواریخ میں اس کے نام کے ساتھ ظالم کا لفظ لکھا جاتا ہے، رعایائے مملکت اور ارکین دولت اس کی حکومت سے بیزار تھے، جا بجا فتنہ و فساد کی آگ مشتعل تھی، امرا سرکشی پر آمادہ تھے رعایا اس کے ظلم و ستم سے تنگ آکر درگاہ رب العزت میں دست بدعا تھی کہ جلد اس ظالم و جابر کا خاتمہ ہو جائے، اور اس کے پنجہ ظلم سے نجات ملے ؛

ملکہ مخدومہ جہاں نرگس بیگم اسی بادشاہ کی بیوی تھی جو آج تک ظالم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے لیکن ایسے نانا کی نواسی تھی جس کا ثانی خاندان بہمنیہ میں نہیں گزرا یعنی فیروز شاہ بہمنی جو شوکت و عظمت میں، اور شاہان بہمنیہ پر امتیاز تمام رکھتا ہے، ایسے پر آشوب زمانہ میں جب کہ تمام سلطنت میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ارکان سلطنت خود سر تھے، اور رعایا بددل تھی، ہمایوں شاہ نے سنہ ۸۶۵ھ میں انتقال کیا، اور عنان حکومت نرگس بیگم کے ہاتھ میں آئی گو ایسے پر خطر زمانہ میں جب کہ قواعد و ضوابط شمسی کا دیباچہ الٹ چکا تھا صنف لطیف کی ایک نازک ہستی کا ایک کمسن بچہ کے لئے انتظام مملکت کو اپنے ہاتھ میں لینا یقینی بادی النظر میں حیرت ناک اور تعجب خیز نظر آئے گا، لیکن ملکہ نے جو علاوہ عظمت خاندانی اور لیاقت ذاتی کے عقل و تدبر، شجاعت و ہمت، سخاوت و فیاضی، قدردانی اور کمال پروری کے جواہرات سے مزین تھی تمام ملکی معاملات میں حصہ لیا اور اپنی دور اندیشی و حسن تدبر سے بتدریج تمام بغاوتوں کا خاتمہ، بدعنوانیوں کا انسداد اور فتنہ و فساد کی آگ کو فرو کر دیا، ملک میں امن و عافیت قائم ہوئی اور رعایا خوشحال ہو گئی،

جب ہمایوں شاہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے شہزادہ نظام شاہ ہشت سالہ کو ولیعہد مقرر کیا اور خواجہ جہاں ترک کو وکیل السلطنت اور خواجہ محمود گاواں ملک التجار کو وزیر قرار دیکر وصیت کی کہ ملکہ مخدومہ جہاں معہ اتفاق وزرا ریاست کا انتظام کرے، چند ہی دن کے بعد ہمایوں شاہ کا انتقال ہو گیا اور حسب دستور سلاطین بہمنیہ فاتحہ سوم کے بعد دربار عام منعقد ہوا اور قاعدہ کے سادات عظام سے دو شخص محب اللہ اور سید شریف نے تیمناً و تبرکاً دائیں و بائیں جانب سے نظام شاہ کو سہارا دیکر تخت فیروزہ پر بٹھایا

نرگس بیگم نہایت عاقل و زیرک تھی، علم و فضل کے زیور سے بھی آراستہ تھی، ملک کے انتظام و اہتمام کا ملکہ بھی رکھتی تھی، حسب وصیت معاملات ملکی و مالی سے مزید واقفیت حاصل کر کے خواجہ جہاں ترک اور خواجہ محمود گاواں جیسے تجربہ کار و کار آزمودہ مشیروں کو وزارت اور وکالت کے عہدوں پر مامور کیا۔ حسن اتفاق سے یہ دو ایسے عدیم النظیر کارپرداز مل گئے جو بہی خواہ سلطنت تھے اور جنہوں نے اپنی شجاعت و ہمت تدبر و پختہ کاری سے سلطنت کی بقا میں بہت سعی و کوشش کی ملکہ کو ان پر بیحد اعتماد تھا تمام امور و مہمات شاہی ان دونوں کی صلاح و مشورہ سے انجام پاتے تھے، ہر روز علی الصباح یہ دونوں باتفاق دربار میں آتے تھے اور عرض اخلاص بجا لاکر ایک عورت ماہ بانو کے ذریعہ تمام امور کے متعلق احکام حاصل کرتے تھے، جو کچھ ملکہ کے احکام صادر ہوتے تھے بلکہ کم و بیش ان کی تعمیل کرتے تھے، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں کے حسن اہتمام سے کاروبار سلطنت بوجہ احسن انجام پائے اور سلطنت کو استقلال حاصل ہوا

جب گرد و نواح کے سلاطین نے سنا کہ تخت بہمنیہ پر ایک خورد سال بچہ بیٹھا ہے، اور عنان حکومت ایک عورت کے ہاتھ میں ہے تو انھوں نے اپنی دیرینہ خواہش کو پورا کرنے اور سلطنت بہمنیہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے اس کو زرین موقعہ خیال کیا، اور ایک دم ہر طرف سے اسپر حریص جانور کی طرح ٹوٹ پڑے، اس کی تباہی کے لئے شاطرانہ چالوں، اور سیاسی حربوں سے کام لیا، تاریخ شاہد ہے کہ سلطنت بہمنیہ کے لئے یہ نہایت نازک وقت تھا، فی الواقعی اگر مخدومہ جہاں کا تدبر اور خواجہ جہاں و خواجہ محمود گاواں کی بہادرانہ و سرفروشانہ کارگذاریاں نظام شاہ کے شامل حال نہ ہوتیں تو دکن کی یہ عظیم الشان سلطنت ہمسایہ طاقتور حکومتوں کا شکار ہو گئی ہوتی،

ایک کمسن بچہ کے تخت نشین ہونے سے سب سے زیادہ تحریص و ترغیب اڑیسہ اور اوریا کے راجاؤں کو ہوئی اور اس موقعہ کو غنیمت جانکر متفقہ طور پر حملہ آور ہوے، لیکن مخدومہ جہاں پریشان ہونے والی یا ہمت ہارنے والی عورت نہ تھی۔ اس نے نہایت استقلال کیساتھ انکی مدافعت کے لئے تیاری کی، اور چالیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئی اور اس عمدگی کیساتھ فوج کی سپہ سالاری کی کہ دشمن کو شکست فاش دیکر مظفر و منصور واپس آئی،

ابھی اس مصیبت سے نجات حاصل نہ ہوئی تھی کہ سلطان محمود خلجی والی مالوہ بھی ایک جرار فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا، ادہر سے بھی مقابلہ کے لئے فوج روانہ کی گئی، قندھار کے پاس معرکہ کارن پڑا، اس زور و شور کے ساتھ لڑائی ہوئی کہ نعروں کے گونج سے زمین ہل پڑ گئی دوست اور دشمن میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا، مگر کسی نے بھی قدم پیچھے ہٹانے کا نام نہ لیا، دونوں طرف کے نبرد آزماؤں نے اپنی بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے، ایک وقت تو ایسا آیا کہ بہمنیہ فوج کامیاب نظر آنے لگی، خلجیوں کی فوج میں ہراسانی و پریشانی نے اپنا تسلط جما لیا تھا، محمود خود میدان جنگ سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ لیکن مصاحبین نے اس کو اس حرکت سے روکا اور استقلال و ہمت سے کام لینے کا مشورہ دیا پھر کیا تھا آن کی آن میں قسمت کا پانسہ پلٹا، یا تو فتح ہو رہی تھی یا اب جان کے لالے پڑ گئے، خود نظام شاہ بھی دشمنوں کی زد پر تھا سکندر خاں نے حق نمک ادا کیا۔ نہایت دلیری کے ساتھ میدان جنگ سے اپنے آقا کو بچا لایا، آخر کار اس لڑائی میں محمود خلجی کو فتح حاصل ہوئی، اس کامیابی نے حرص و آز میں اور اضافہ کر دیا، برار اور بیڑ پر قابض ہو کر اپنے پاؤں پھیلائے، بیدر کی طرف رخ کیا سلطنت کو بالکل تباہ کرنے کی دل میں ٹھان لی، لیکن ملکہ مخدومہ جہاں اس کی ان جارحانہ کارروائیوں سے غافل نہ تھی وہ اندر ہی اندر

اس کے مقابلہ کی تدبیریں سوچ رہی تھی، آخر کار اس نے طے کیا کہ باہر سے امداد حاصل کیجائے چنانچہ اس نے فوجی امداد کے لئے محمود شاہ گجراتی کو خط لکھنے کے لئے محمود گاواں کو ہدایت کی، محمود شاہ اسی ہزار سوار لیکر مدد کے لئے روانہ ہوا، گجراتی اور دکھنی فوج نے بالآخر محمود خلجی کو کامل شکست دی وہ بحالت تباہ، تمام ساز و سامان اور اسباب شاہی چھوڑ جان بچاکر بھاگ گیا،

شاہان بہمنیہ کا یہ دستور تھا کہ پہلی بیوی کو ملکہ مخدومہ جہاں کا خطاب دیا کرتے تھے، اور یہی ملکہ سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے عموماً اس بات کی پابندی کی جاتی تھی کہ پہلی بیوی خاندان شاہی سے ہو، رواج کے مطابق ملکہ نرگس بیگم نے بھی نظام شاہ کی شادی اپنے ہی خاندان کی ایک شہزادی سے کی اور جشن شاہانہ ترتیب دیا اسی شب کو جب کہ مجلس زفاف آراستہ ہوئی، بزم عیش و عشرت کی ترتیب پانے سے ایک دنیا شادی و خرمی میں مشغول ہوئی۔ خدا جانے کیا بلائے ناگہانی نازل ہوئی کہ آدھی رات کے بعد محل شاہی میں نالہ و زاری سے شور بپا ہوا اور یہ خبر وحشت ناک سننے میں آئی کہ نظام شاہ نے اس جہاں سے رحلت کی "۸۶۷ھ" نوحہ و ماتم سے قیامت کا نقشہ کھنچ گیا عشرتکدہ ماتم کدہ بنگیا، اگرچہ مخدومہ جہاں کا دل کثرت رنج و غم سے پارہ پارہ ہو رہا تھا لیکن اس نے نہایت استقلال سے کام لیا۔ آہ ایسی شفیق ماں کو کس قدر رنج ہوا ہوگا، جس نے اس کمسن بچہ کو اپنی آغوش محبت میں چھپائے، صبر و استقلال سے اس کی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے سلطنت کے امور نہایت عمدگی سے انجام دے جبکہ افق سلطنت بہمنیہ پر مخالفت و دشمنی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور شوہر کے ظالمانہ طرز عمل سے رعایا نالاں اور امرا بد دل تھے ملکہ نے جس جگر گوشہ کے لئے ان تمام کانٹوں کو دور کیا، اور راہ کو ہموار کیا، فتنہ و فساد کی وجہ سے جو خرابیاں پڑ گئیں تھیں ان کو رفع کیا، وہی نور نظر عالم جوانی میں اور عین شب عروسی میں داغ مفارقت دے گیا، یہ سب کچھ تھا مگر اس دلیر اور باہمت خاتون نے مستقل مزاجی سے کام لیا، اور دامن صبر و شکیب کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بلکہ سب سے پہلے اسکی تجہیز و تکفین کی فکر کی۔ پھر جب دستور فاتحہ سیوم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دوسرے کمسن فرزند محمد شاہ کو تخت نشین کیا،

ملکہ نے محمد شاہ کی تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ کی، وہ خود تعلیم یافتہ تھی پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ تاج و تخت کے مالک کی تعلیم و تربیت میں غفلت و لاپروائی کرتی۔ اس نے ایک فاضل ہستی کو اس عہدے کے لئے منتخب کیا یعنی شوستری جیسے عالم کو اس کا اتالیق مقرر کیا شوستری نے بادشاہ کو بہترین طریقہ پر تعلیم دی۔ خود شاہزادہ نہایت ذکی، ذہین تھا، پھر مخدومہ جہاں کی نگرانی اور شوستری کی تربیت نے سونے میں سہاگے کا کام کیا، یہ بادشاہ ایسا لائق و عالم نکلا کہ خاندان بہمنیہ میں فیروز شاہ کے بعد اس سے بہتر اور کوئی نہیں گزرا۔

ملکہ مخدومہ جہاں کے زمانہ میں ایک ایسا اہم واقعہ گزرا ہے جس کا یہاں تذکرہ کر اظہار حق سے گریز کرنا ہے، اسی واقعہ کو بعض تاریخ نویسوں نے نہایت آب و تاب کے ساتھ ظاہر کرکے سختی کے ساتھ ملکہ کی طرز عمل پر نکتہ چینی کی ہے۔ اور اس کو محسن کش و احسان فراموش قرار دیا ہے لیکن اگر اطمینان کے ساتھ سیاسی پہلو پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعات و حالات کا لحاظ کرتے ہوئے مجبوراً ملکہ کو اس طرح کرنا پڑا، وہ الزام جو ملکہ پر عاید کیا جاتا ہے کہ وہ خواجہ جہاں ترک کے قتل کا باعث ہوئی، اور ایک وفادار اور جانثار سلطنت کی خدمت کا عوض اس طرح دیا۔ اب ہم اس بات کی کوشش کریں گے کہ واقعات کا اظہار کرتے ہوئے، یہ بات ثابت ہو جائے

کہ اس طرح کا سلوک کرنے میں ملکہ حق بجانب تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ جہاں نے گرتی ہوئی عمارت کو تھام لیا۔ سلطنت کے استحکام میں کوشش کی اور ابتدا میں اچھا بندوبست کیا مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد اس سے بے اعتدالیاں اور حماقتیں سرزد ہونے لگیں، خود کو سلطنت کا مختار کل سمجھکر حکومت جتانے لگا یہاں تک کہ کسی کو خیال میں نہ لاتا تھا نہ عاقبت اندیشی سے محل والوں کی تنخواہیں روکدیں، اور امرائے قدیم کی جاگیریں چھین کر اپنے آوردوں کو دینا شروع کیا اور بعض اپنے طرفداروں کو بڑے بڑے عہدے بھی دئے چونکہ بہت سی مہمات میں شریک ہوکر، دلیری اور بہادری دکھاکر خاص افتخار حاصل کرچکا تھا اس واسطے اپنی قوت واقتدار پر بہت زیادہ گھمنڈ ہوگیا، نشۂ غرور سے سرشار ہوکر دست تغلب وتصرف شاہی خزانوں پر دراز کیا، ملک التجار محمود گاواں کو مد مقابل سمجھکر ہمیشہ اس کو سرحدی خدمتوں پر بھیجا کرتا تھا تاکہ وہ مرکز حکومت سے دور رہے اور اس کو اپنی خواہشات کے پورا کرنے کا موقعہ ملے۔

ملکہ مخدومہ جہاں، محمود خلجی کے واقعہ کے زمانہ ہی سے بدظن ہوگئی تھی۔ اس واسطے کہ اس نے سکندر خاں کو اس جرم میں کہ وہ نظام شاہ کو معرکہ کارزار سے نکال لایا تھا۔ قید کردیا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ خواجہ جہاں کا یہ خیال تھا کہ بادشاہ کے میدان جنگ سے ہٹتے ہی سپاہیوں میں بددلی پھیل گئی جس کی وجہ سے شکست ہوئی، ایک لحاظ سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے اس واسطے کہ مشرق میں بادشاہ ظل اللہ سمجھا جاتا ہے، اور مشرق بادشاہ پرستی کے لئے مشہور ہے، جب تک وہ نظروں کے سامنے ہے اہل مشرق کو بیحد تقویت حاصل ہوتی ہے بہرحال خواجہ جہاں کی نیت کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کی طرز عمل سے ملکہ مشکوک ہوچکی تھی۔

ایشیائی درباروں میں یہ بات اکثر مشاہدہ میں آتی ہے کہ جو امیر بادشاہ کے جلوس سلطنت میں سعی بلیغ کرکے فروغ پاتا ہے اسکی خواہش طبعی یہ ہوتی ہے کہ جملہ مقدمات جزئی وکلی میں بادشاہ پر تسلط واقتدار حاصل ہو، لیکن فطرت انسانی سے مجبور سلاطین بھی ایسے امیر کی خواہش بیجا کو ناپسند اور تسلط کو گوارہ نہیں کرتے، جسکا نتیجہ خانہ جنگی اور ان میں سے کسی ایک کا استیصال ہوتا ہے۔

دور اندیش وذی عقل ملکہ نے جب یہ دیکھا کہ خواجہ جہاں روز بروز اپنی قوت بڑھا رہا ہے تو وہ اس کے اوضاع واطوار سے بیحد فکرمند ہوئی اور اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں موقعہ پاکر نمک حرامی نہ کرے، اس لئے اس اولوالعزم ملکہ نے سمجھ لیا کہ خواجہ کا وجود سلطنت بہمنیہ کے حق میں مضر ہے اور جلد اس کا انسداد ہونا چاہئے اس کی مفسدی وکورنگی کو محمد شاہ کے ذہن نشین کرا کے اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ جلد خواجہ کو تیغ بیدریغ کرکے سلطنت کو اس کے شر سے محفوظ رکھے ۸۸۰ھ کا واقعہ ہے کہ ایک دن حسب معمول خواجہ دربار میں آیا، مگر خلاف معمول نظام الملک کو سپاہیوں کی ایک جماعت کے ساتھ دیکھکر متعجب ومتفکر ہوا، لیکن دربار سے بغیر کورنش کئے نکلنا مشکل تھا۔ بہ امر مجبوری ولاچاری معمولی امور میں مشغول ہوا، اسی اثنا میں دو ضعیف عورتیں محلسرا سے برآمد ہوئیں اور سلطان سے عرض پرداز ہوئیں کہ جو کام قرار دیا گیا ہے وہ جلد طے پائے، یہ سنتے ہی سلطان نے نظام الملک کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ فوراً قتل کردو۔ نظام الملک جو اس کا دشمن تھا بادشاہ کے حکم ہی کا منتظر تھا بے تامل اس کا ہاتھ پکڑ کر دربار سے باہر لے گیا اور تلوار کو میان سے نکال کر اپنے ہی ہاتھ سے کام تمام کردیا، ایک ایسے شخص کا قتل کرنا جس نے سلطنت میں اپنا رعب اور خاص اقتدار قائم کرلیا ہو

کوئی آسان کام نہ تھا مگر ملکہ نے حسن تدبیر اور دانائی سے اس معاملہ کو اس عمدگی سے انجام دیا کہ کوئی فتنہ وفساد بپا نہ ہوا۔

بہ تدبیر زاں پس خردمند زن بہ فرمان خود ساخت ملک دکن

جہانے زعدلش بہ آسودگی ....

شخصی حکومتوں میں یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس طرح بعض امراجب زیادہ مقتدر ہوجاتے تھے تو ان کا وجود سلطنت کی بقا اور بادشاہ کی سلامتی کے لئے مضر ہوجاتا تھا، عام طور پر شخصی سلطنتوں کے اختیارات اور ان کی مجبوریوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ سیاست ملکی اس قسم کے سلوک کی متقاضی ہوتی ہے اسواسطے کہ ہر ایک سلطنت میں شخصی ہو یا جمہوری یہ نہایت مشکل ہے کہ ایک شخص نیک نام ہو کر زندگی بسر کرے، کچھ لوگ اس کے زیادہ بارسوخ ہونیکی وجہ سے اس کے مخالف اور دشمن ہوجاتے ہیں اور پھر بادشاہ کا غیظ وغضب اس کے روزافزوں اقتدار کو دیکھکر ترقی کر جاتا ہے، اسیطرح کی ایک مثال جعفر برمکی کی ہے۔ خاندان برمکی سے جو فائدہ خاندان بنوعباس کو پہونچا وہ محتاج بیان نہیں، تاہم انتظام مملکت اور سیاست ملکی کی خاطر ہارون رشید نے وہ کام کیا جو اس کے شایان شان نہ تھا اور جو مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا یعنی قتل برمکی جس کی وجہ سے وہ محسن کش اور احسان فراموش مشہور ہوا۔ یہاں امام المورخین علامہ ابن خلدون کی رائے کا درج کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

"برامکہ پورے طور پر دولت عباسیہ پر قابض ہوگئے تھے، یہاں تک کہ وقت ضرورت ہارون الرشید کو تھوڑا سا روپیہ بھی خزانہ سے نہیں مل سکتا تھا۔ برامکہ کا قدم، استقلال واستحکام کیساتھ سلطنت میں جم گیا تھا۔ اور وہ حکومت پر غالب تھے رشید کو سلطنت میں دخل وتصرف کا کچھ بھی اختیار باقی نہ تھا اور تمام دنیا میں آہستہ آہستہ ان کی شہرت پھیل گئی تھی اور سلطنت کے تمام اعلیٰ درجہ کے منصب انھوں نے حاصل کر لئے تھے"

ان مذکورۂ بالا واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم خواجہ جہاں کے طرز عمل پر نظر ڈالیں تو ہمکو ان دونوں میں تطابق عظیم نظر آتا ہے۔ لہذا ان پر غور کرتے ہوئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی طرح بھی ملکہ نرگس بیگم کا طرز عمل قابل اعتراض نہیں، اور نہ اس کی وجہ سے اس کے حالات زندگی میں کوئی تاریک پہلو پایا جاتا ہے،

ملکہ مخدومہ جہاں، محمد شاہ کے ایام بلوغ تک نیابتاً انتظام کرتی رہی، جب اُس نے عالم شباب میں قدم رکھا تو ملکہ کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوئی بہت جلد ملکہ اس فرض سے سبکدوش ہوگئی، خاندان شاہی کی ایک حسین، زہرہ جبین شہزادی کیساتھ نہایت تزک واحتشام سے شادی کا اہتمام کیا، اور تمام مہمات سلطنت کا انتظام فرزند دلبند کے سپرد کر کے گوشہ نشینی اختیار کی اور بقیہ عمر صوم وصلوٰۃ اور تلاوت قرآن مجید وفرقان حمید میں صرف کی،

گو محمد شاہ کلیتہً بادشاہ تسلیم کر لیا گیا تاہم وہ ہمیشہ اہم امور میں ملکہ سے مشورہ لیا کرتا تھا، اور اس قسم کے معاملات ملکہ کی دانائی وعقل کی رسائی اور حسن تقریر کی وکالت سے سلجھتے تھے چونکہ سعادت مند فرزند اپنی والدہ کی حقیقی خوبیوں سے واقف تھا، وہ ملکہ کی بیحد تعظیم وتکریم کرتا تھا، بلاناغہ روزانہ سلام کے لئے حاضر خدمت ہوا کرتا تھا۔

حسن و جمال میں بھی ملکہ کا کوئی ثانی نہ تھا، حسن صورت کی طرح حسن سیرت میں بھی وہ اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی، وہ ایک بے نظیر و بے عدیل حسین و جمیل خاتون تھی جو کمالات علمی و انتظامات ملکی میں بیحد دخل رکھتی تھی، اس کے علمی ذوق کا یہ نتیجہ تھا کہ اس کی ڈیوڑھی بڑے بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں نہ فلسفیوں اور شاعروں، ریاضی دانوں اور مہندسوں، فصیحوں اور ادیبوں کا مجمع رہا کرتا تھا، ملک دکن میں اہل علم و صاحبان کمال کا مرجع و ماوی اسی کا گھر تھا، اس کے مردانے مکان سے بڑی علمی صحبت ملک بھر میں کہیں نہ تھی اہل کمال کی جیسی وہ قدر کرتی تھی اس کا اور اس کے علمی شوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے دربار میں ہمیشہ منتخب روزگار کا مجمع رہا کرتا تھا، اور اس کے سلوک کی وجہ سے بڑے بڑے امراجان نثاران سلطنت بن گئے اور خیر خواہی میں جان دینا معمولی بات سمجھتے تھے۔

مہمات سلطنت کو انجام دینے کے علاوہ ملک میں ضبط و انتظام رکھنے اور انصاف و عدل کیساتھ معاملات طے کرنے میں بھی وہ شہرت حاصل کی کہ لوگوں نے نوشیرواں کے عدل و انصاف کو بھلا دیا اور وہ قصے داستان پارینہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے، گو کہنے کو تو وہ صنف لطیف کی ایک نازک ہستی تھی لیکن اس میں ملک گیری و کشور ستانی کا جذبہ موجود تھا، نیز اس نے کفر کے رفع کرنے میں بہت سعی و کوشش کی، کنجی و کالستری جیسے مقامات اس کے قبضہ تصرف میں آ گئے، ہر روز فتح و کامیابی اسے حاصل ہوتی گئی، اور اقبال و طالعمندی نے کامرانی کے پھول اس کے قدموں پر نچھاور کئے،

اس کا فیض عام، امیر و غریب برنا و پیر کافر و مسلمان خورد و بزرگ سب کو یکساں مستفید کرتا تھا، اس کی سخاوت نے لوگوں کے دلوں سے حاتم کی سخاوت کی داستان کو فراموش کرا دیا، نیک کاموں میں سب سے پیش پیش رہتی تھی کوئی شخص اس کے در سے بے نیل مرام واپس نہ ہوتا تھا اس نے سرائے اور مسجدیں تیار کرائیں، جا بجا سڑکوں پر باؤلیاں بنوائیں تاکہ مسافر سفر کرنے میں تشنگی آب سے جاں بلب نہ ہو جائیں، ملکہ بیحد رحمدل تھی، مظلوم و ستم رسیدہ کی دستگیری و اعانت کرتی تھی بڑی عالی دماغ و لائق تھی۔ امور مملکت کی واقفیت اور سیاست دانی کے لحاظ سے اس کا مرتبہ ہند کی مستورات میں بہت بلند ہے، بہادری و دلیری میں ایسی ہی مشہور تھی جیسا کہ چاند بی بی احمد نگری ہمت و جرات میں، جب تک زندہ رہی مہمات سلطنت کو بحسن و خوبی اپنے دونوں معتمدین کی مدد سے انجام دیتی رہی ملکہ کے عہد میں تمام رعایا خوشحال اور فارغ البال تھی، ظلم و ستم، جبر و تشدد کا نام و نشان نہ تھا، ہمایوں شاہ کے وقت میں جتنی سختیاں کیگئی تھیں، اسی قدر ملکہ نے عمدہ سلوک کیا، اور رعایا کی فلاح و بہبود میں ہمہ تن منہمک رہی، سچ تو یہ ہے کہ ملکہ نے اپنے شوہر کی بدنامی کو نیک نامی سے تبدیل کر کے اس کی بہت کچھ تلافی کر دی، اور فی الحقیقت ہمایوں شاہ کے ظلم و ستم کو لوگ بھول گئے۔

جب بلگواں کے راجہ کی سرکشی کی خبر سنکر اس کی تادیب کے لئے محمد شاہ روانہ ہوا تو ملکہ مخدومہ جہاں بھی اس کے ہمراہ گئی اور اپنے زریں مشوروں سے اس کو ہدایت کرتی رہی، آخر کار ملکہ کی نیک صلاح پر عمل کرنے سے فتح حاصل ہوئی اور راجہ پابزنجیر دربار شاہی میں حاضر ہو کر عفو تقصیر کا خواستگار ہوا، کامیابی کے ساتھ اس مہم کو سر کر کے جب محمد شاہ واپس ہو رہا تھا اور ابھی دارالسلطنت تک پہونچا بھی نہ تھا کہ راستہ میں ملکہ سخت بیمار ہو گئی، اطبا و حکما نے معالجہ میں بیحد کوشش کی لیکن چونکہ پیمانہ عمر لبریز ہو چکا تھا، سعی و کوشش مفید ثابت نہ ہوئی، راستہ ہی میں ملکہ نے عالم فانی سے عالم بقا کی طرف کوچ کیا، محمد شاہ کو ایسی شفیق و مہربان والدہ کے انتقال کا بیحد

رنج ہوا، لاش کو دفن کرنے کے لئے شاہانہ تزک و احتشام سے دار السلطنت بیدر کی طرف روانہ کیا، اور بادشاہ کے حسب الحکم سلاطین بہمنیہ کے مقبرہ میں سپرد گور کردی گئی۔

حقیقت میں ملکہ بڑی عالی ہمت تھی، اس ملکہ کی حسن تدبیر سے سلطنت بہمنیہ کو محمد شاہ کے زمانہ میں عروج حاصل ہوا، اور وسعت ملک میں بیحد اضافہ ہوا، رعایا خوشحال تھی، شاہی خزانہ زر و جواہر سے معمور تھا، اس ملکہ کی دور اندیشی اور عنایات شاہانہ نے خواجہ محمود گاواں کو ملک کا خیر خواہ بنایا۔

محمد شاہ نے حکم دیا کہ ایسی عالی ہمت اور منصف مزاج اور لائق روزگار ملکہ کا گنبد مزار بھی مستحکم سنگین اور عالیشان بنایا جائے چنانچہ اسیطرح حکم کی تعمیل کی گئی اور ملکہ کا مزار باوجود حوادث روزگار اور انقلاب زمانہ کے اب تک باقی ہے، اور یہ آثار صنادید عہد ماضی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

کسی شاعر نے ہر دل عزیز ملکہ کی تاریخ وفات عربی میں کہی تھی جسے ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

درۃ التاج مریم الاتار	اذ جارت ندا رباعتہا
ملہم الغیب قال فی التاریخ	ابد اللہ ملک وارثہا

ماخذ:- (۱) تاریخ فرشتہ (۲) تحفۃ الملوک (۳) چمن گلشن (۴) تاریخ سلاطین دکن (۵) محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن (۶)

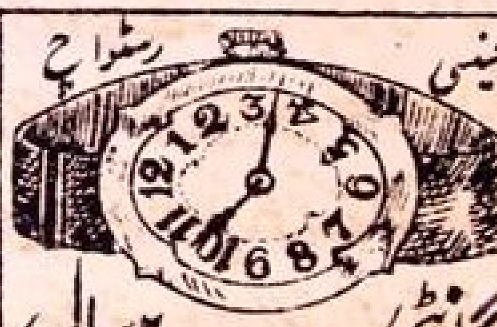

گارنٹی ۶ سال

۲۲ کیرٹ گولڈ پلیٹڈ رسٹواچ اپنی خوبی میں پچاس روپیہ کی گھڑی سے مقابلہ کرتی ہے ہر موسم میں سچا ٹائم بتاتی ہے کاریگر کو اسکی مشین پر بہت ناز ہے۔ از حد خوبصورت و پائدار ہے کاریگر کی جدید ساخت ہے اس وجہ سے قیمت کم ہے یعنی معہ محصول ڈاک و پیکنگ۔ چھ روپیہ

اس قدر ارزاں قیمت میں نگدار اسٹین گولڈن جڑاؤ بندے، جن کے نگوں کی چمک آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی ہے کانوں میں سینکڑوں روپے کے معلوم ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر عورت ان پر فدا ہے ایک قیمتی مخملی بکس میں۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

گارنٹی ۶ سال

اس ٹائم پیس کی پشت پر گھنٹی ہے جو ایسی سریلی آواز میں الارم بجاتی ہے کہ میٹھی نیند سے بیدار ہوتے وقت انسان کو اسکی آواز ناگوار نہیں گذرتی الارم اسقدر کافی عرصہ تک بجتا ہے کہ انسان کو جگا کر ہی چھوڑتا ہے ٹائم پیس از حد شاندار نہایت خوبصورت۔ اور بالکل سچا وقت بتاتا ہے۔

قیمت علاوہ محصول ڈاک پیکنگ سات روپیہ

اعلان ان چاروں اشیاء کی قیمت ملکر بیس روپیہ ہوتی ہے مگر جو صاحب چاروں اشیاء یکدم طلب کریں ان کو نصف قیمت یعنی دس روپیہ میں مع ان کیچاروں کی محصول ڈاک پیکنگ بھی ہمارے ذمہ ہوگا چاروں اشیاء سے کم کے خریدار کے لئے کوئی رعایت نہیں۔

منیجر ٹریڈ ہاؤس اجمیری گیٹ ۳ دہلی

فلسفۂ مذہب

(بہ سلسلۂ ما سبق)

اب ہم آنحضرت کی اس خالص نبوت کی زندگی پر جو آپ نے مکہ میں گزاری ہے نظر ڈالتے ہوئے نبوت کے اوصاف کا ایک معیار قائم کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

اول اس شخص کا اخلاق اس قدر بلند ہو کہ دوست و دشمن سب اسپر اعتبار کریں وہ شخص کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو نہ اس نے کسی امانت میں خیانت کی ہو۔

دوم۔ وہ ایسا موثر کلام کرے جسکے مثل لوگ نہ کر سکتے ہوں اگرچہ وہ کوشش بھی کریں۔

سوم۔ وہ باوجود امی ہونے کے ایسی باتوں کی خبر دے جس کی تصدیق دوسرے ذرائع سے ہو سکے۔

چہارم۔ اس کے کلام میں فحش ولاطایل باتیں نہ ہوں۔

پنجم۔ اس کا مقصد اپنی بڑائی اور عظمت کے بجائے دوسروں کی بھلائی ہو۔

ششم۔ وہ لوگوں کو ایسے کاموں کی طرف بلائے جن کو عقل سلیم خود بخود مان لے۔

بس یہ شرائط اگر ایک نبی میں پائے جاتے ہیں تو عام اس سے کہ اس نے متعدد شادیاں کی ہوں۔ جہاد کیا ہو۔ کھاتا پیتا ہو یا بازاروں میں چلتا پھرتا ہو، ہم اُسکو نبی ماننے کے لئے تیار ہیں اور اس کا کلام یقیناً الہامی ہوگا کیونکہ بغیر اس کے کلام کو الہامی مانے ہوئے نہ ہم اسکے قول پر اعتبار کر سکتے ہیں اور نہ اس کے احکام کی تعمیل پر دل سے مجبور ہو سکتے ہیں۔ لہذا مذہب کے لئے نبوت وکلام الہامی لازم ملزوم ہے۔ اور یہ صورت تقریباً ہر ملک وقوم میں پیش آئی ہے اور دنیا کے تمام مذاہب میں جو اختلاف رونما ہے وہ یا تو نبوت کی باتوں پر متوجہ نہ ہونے یا نہ سمجھنے یا ان کو فراموش کر دینے کی وجہ سے ہے۔

مذہب کے اصول یعنی خداشناسی۔ تکوین وحشر۔ سزا وجزا۔ ایسی باتیں ہیں جن میں انسانی عقل بہت کم رہبری کر سکتی ہے۔ اور جب کبھی انسانی عقل نے مذہب بنایا ہے وہ وحشیوں کے خود رو مذہب سے بہت کم فرق رکھتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ اگر مذہب فطری چیز نہیں ہے بلکہ اکتسابی ہے تو کیا انسان بلا مذہب کے بھی دنیا میں رہ سکتا ہے۔ یہ سوال معمولی نہیں ہے جبکہ مہذب دنیا کے لوگ بہ بانگ دہل اس کا اعلان کر رہے ہیں کہ وہ مہذب ترین قوم کے افراد ہیں اور کسی مذہب سے سروکار نہیں رکھتے پھر اگر ایک طرف یہ صدائے بے ہنگام ہے تو دوسری طرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فلسفی ونکتہ دان اپنے قومی مذاہب میں سخت منہمک رکھتے ہوئے پائے گئے۔ اور ایسی باتیں انھوں نے کیں اور کہیں کہ مشکل سے عقل سلیم ان پر یقین کر سکتی ہے۔ سقراط کی فراست میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن سقراط مرتے وقت اپنے شاگردوں کو وصیت کر جاتا ہے کہ اس کے ذمہ فلاں دیوتا کی مرغے کی قربانی

باقی رہ گئی ہے وہ پوری کیجائے۔ مذہب کا یہ کرشمہ درحقیقت نہایت تعجب انگیز ہے خود ہمارے ہم وطن ہی کیسے کیسے عالم و فلسفی ہیں مگر مذہب کے اعتقاد میں وہ اور ایک دہقانی جو ایک گول پتھر پر صبح جل چڑھاتا ہے برابر ہیں۔ یہ عقدہ غالباً کبھی حل نہ ہوگا کہ وہ سارے خرافات جو توحید کے خلاف دنیا کی متعدد قوموں میں کثرت سے معمول بہ ہیں ان کو ان کے ماننے والے خود ہی لغو سمجھتے ہیں۔ لیکن سوسائٹی کے ڈر سے زبان نہیں کھول سکتے یا درحقیقت وہ اس کو ویسا ہی سنجیدگی سے باور کرتے ہیں جیسا کہ ایک نادان شخص باور کرتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مذہب کی تاریخ میں اسلام سے قبل صرف یہود بنی اسرائیل میں دیوتاؤں کے خلاف ایک خدائے واحد کے وجود کا خیال پایا جاتا ہے۔ ورنہ کیا کلدانی کیا مصری۔ کیا رومی۔ کیا یونانی سب مذاہب میں وہی باتیں ہیں جو انسان نے خود اپنے دل سے پیدا کرلیں اور جو بیشمار دیوتاؤں کی پرستش پر مبنی ہیں۔ کم سے کم یہ یورپ کی تحقیق ہے۔ ممکن ہے کہ ان کو دنیا کے کسی مذہب میں خدا کا وجود نہ ملے کیونکہ انھوں نے یہ کلیہ پہلے سے بنا لیا ہے کہ صرف بنی اسرائیل ہی کو خدا شناسی کا پتہ حاصل تھا۔ مگر قرآن ہر قوم میں نبوت کو تسلیم کرتا ہے۔ پس ان نبیوں کی تعلیم کہاں گم ہوگئی۔ ضرور ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ اوہام انسانی میں نبوت کی باتیں گم ہیں اور انکی تلاش سے ہم کو بہت کچھ سراغ مل سکتا ہے۔ رومیوں اور یونانیوں کے بارے میں تو پتہ نہیں چلسکتا کیونکہ مسیحیت نے خود عمداً سے انکی اصل کو دنیا سے مفقود کردیا تاکہ مسیحیت کا ستارہ تاریکی میں زیادہ روشن نظر آئے۔ مگر مشرق کے مذاہب میں نبوت کے خیالات ضرور ملتے ہیں۔ چنانچہ قدیم مصریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فرعون (اسوقیس چہارم) نے یہاں تک کوشش کی کہ اپنے پرانے معبودوں اور اس پائے تخت کو چھوڑ کر جو معبد دوال یا ماں۔ تامے اور ری کی سرپرستی میں بنایا گیا تھا، تل العمرانہ کے قریب ایک نیا پایۂ تخت اپنے نئے اور تنہا خدا آتون کے نام سے بنوایا اور خود اپنا لقب انی ناتوں (یعنی آتون کا پرتو نور) رکھا۔ اس نئے معبود کے متعلق کتاب تعلیمات میں جو مناجات کی صورت میں قدیم مصریوں کے قول کے مطابق الہامی بتائی جاتی ہے۔ توحید الٰہیات کے وہ خیال پائے جاتے ہیں جنکو ہم واقعی الہامی کہسکتے ہیں۔ لیکن اخناتون کے مرنے کے ساٹھ سال کے اندر قدیم بت پرستی کے خیالات نے پھر پلٹا کھایا اور نئے خیالات جو ایک خدا کی پرستش پر مبنی تھے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اٹھارہویں خاندان کے سلاطین جن کے زمانے میں مصریوں میں توحید کا رواج تھا ٹھیک وہی زمانہ تھا جب حضرت یوسف مصر میں تھے تو گویا تاریخی کتبے اور قرآن مجید دونوں اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت یوسف درحقیقت مصر کے مسلم معبوث پیغمبر تھے۔ اور ان کی تعلیم سے مصریوں کے خیالات بدل گئے۔ اسیطرح قدیم کلدانیوں میں حمورابی کے زمانے کے بعد سے جبکہ بابل کی سلطنت و مذہب کی تشکیل ہوئی۔ بعل کے لئے وہی صفات مانے جاتے تھے جو ایک خدا میں سمجھے جاسکتے ہیں، اور وہاں بھی کتبات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت نوح کی تعلیم ایک عرصہ تک اُن میں کا میاب رہی تا آنکہ انھوں نے بھی وہ مذہب عیسائی مذہب کی طرح خود حضرت نوح کو اتو نام کا ایک دیوتا بنالیا۔ ہندوؤں کے مذہب میں بھی بقول البیرونی عوام سے بالاتر ایک طبقہ تھا جنکا خیال خدا کی نسبت بالکل الہامی کہا جاسکتا ہے۔ وہ خدا کو واحد ازلی۔ قادر مطلق خالق کائنات وغیرہ وغیرہ صفات کے ساتھ ویسا ہی مانتے تھے جیسا ہم مسلمان۔ چنانچہ کتاب پاتنجلی میں جسکا حوالہ البیرونی نے دیا ہے شاگرد اپنے استاد سے سوال کرتا ہے "وہ کونسا معبود ہے جس کی عبادت انسان کو سعید بناتی ہے"؟ استاد جواب دیتا ہے۔ وہ وہی ہے

جو ازلی و بے ہمتا ہے - وہ عذاب و رحمت کے لئے کسی کا محتاج نہیں وہ انسان کے خیال میں نہیں آسکتا - وہ استاد بے مثل ہے اور کسی قسم کی تشبیہ اس کے لئے لغو ہے - وہ خود اپنے وجود سے موجود ازلی ہے وہ عالم و دانا ہے بلکہ وہ خود علم ہے اور لاعلمی کی صفت خدا میں پیدا ہی نہیں ہوسکتی شاگرد پھر سوال کرتا ہے " کیا اس کے علاوہ بھی اس میں کچھ اور صفات ہیں " استاد جواب دیتا ہے - وہ بلند ہے اس کی برتر ذات مکان کی ضرورت سے مستغنی ہے - وہ خالص نیکی ہے وہ علیم و خبیر ہے " شاگرد پھر سوال کرتا ہے " کیا وہ کلام کرسکتا ہے " استاد جواب دیتا ہے " چونکہ وہ عالم ہے اس لئے وہ کلام کرسکتا ہے " وغیرہ - اسی طرح بھاگوت گیتا میں باسدیو ارجن کے مکالمہ میں باسدیو فرماتے ہیں " میں کائنات ہوں بلا ابتدا و آخر ہستی لاعموت ہوں، میں اپنی رحمت سے بے نیاز ہوں - مجھ سے کسی ہستی کی تشبیہ نہیں ہوسکتی میں کسی خاص فریق کا طرفدار نہیں - میں نے ہر ہستی کو اسکی ضرورت کا تمام سامان دیدیا ہے - اس لئے جو میری ہستی کو پہچانتا ہے اور میرے مانند ہونے کے لئے مجاہدۂ نفسی کرتا ہے - اس کے علائق کی بیڑیاں کٹ کر اس کو آزادی و نجات ابدی حاصل ہوتی ہے "

ایک دوسری جگہ باسدیو نے فرمایا ہے " انسان کا فطری تقاضا ہے کہ وہ اپنی ضرورت میں خدا کو یاد کرے - جو مجھے ازلی و لم یلد و لم یولد مانتا ہے - خالق اکبر جانتا ہے - وہی تمام انسانوں میں گناہوں اور خطاؤں سے مبرا ہے " فلاسفہ یونان و روما کے خیالات میں بھی ہمکو بہت کچھ اس کے پرتو نظر آتے ہیں - سات حکمائے یونان جو ارکان عقل کے نام سے مشہور ہیں انکا خیال تھا کہ تمام چیزیں ذات واحد سے نکلی ہیں - اور انسان دوسرے غیر ذوی الارواح مخلوق سے یہ فرق رکھتا ہے کہ وہ ان سے ایک درجہ اس ذات واحد یا سبب اول سے قریب تر ہیں - ان حکمار کا خیال تھا کہ عالم ایک ہی شے ہے اور سبب اول ان میں مختلف جلووں سے ظہور کرتا ہے اور انسان جو سبب اول سے لگاتا ہے وہ آخر کار اس میں جذب ہوکر اپنی ساری ہستی فنا کر دیتا ہے - افلاطون کے اس قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ " دیو باس (خدائے واحد) جنکو غیر اقوام منجملہ اور دیوتاؤں کے ایک دیوتا جانتے ہیں بوجہ اس کے کہ اس کو بقا حاصل ہے - اور " دیوتاؤں سے جدا ہے " پھر ایک جگہ افلاطون نے کہا ہے " خدا ایک ہی ہے - خدا متعدد تعدادوں میں نہیں ہے " اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں کے بیشمار دیوتا درحقیقت فلاسفہ کے نزدیک وہی صورت رکھتے تھے جو ہمارے یہاں فرشتوں کی ہے - عوام نے فرشتوں کو خدا کے درجہ تک بڑھادیا جیساکہ عرب کے عوام نے ان کو خدا کی بیٹیاں کہنا شروع کردیا - چنانچہ جالینوس کا قول ہے کہ " یہ صحیح ہے کہ اسقلابوس دیوتا کسی زمانے میں انسانیت کے جامے میں تھا - اس کے بعد خدا نے اس کو ملائکہ کا درجہ دیدیا "

پس قرآن کا یہ اصول کہ " ولکل امۃ رسول فاذا جاء رسولھم قضی بینھم بالقسط وھم لا یظلمون - ایک حقیقت ہے جس کی بے نقابی کا دنیا کو ابھی انتظار ہے - عرب کی قوم جو بت پرستی میں دنیا کی کسی دوسری قوم سے کم نہ تھی - اس میں بھی نبوت کی آواز ایک زمانے میں گونجا کی - چنانچہ ہود پیغمبر کی بعثت کا ذکر قرآن میں موجود ہے - اس کی لفظ بلفظ تائید یمن کے اس مشہور کتبۂ حصن غراب سے ہوتی ہے - جس نے دنیا میں صرف حضرت ہود کا وجود ہی ثابت نہیں کردیا بلکہ اسنے قرآنی امور کی بھی تائید کردی - (دیکھو فارسٹر کا قدیم جغرافیہ عرب)

پس انسان مذہب کے اختیار کرنے پر مجبور ہے اگرچہ وہ باوجود اعلیٰ فہم و فراست رکھنے کے مذہب میں نہایت لوچ و لچر باتیں پیدا کرے مگر مذہب سے خالی ہونا انسان کے لئے ممکن نہیں - کیونکہ اس کا تعلق انسان کی سائیکالوجی سے ہے - اصل یہ ہے کہ انسان کو مذہب

کی طرف لانے والا "ملک الموت کا ہاتھ ہے۔ انسان کی خودی اس کو اس بات کے لئے مجبور کرتی ہے کہ وہ غور کرے کہ یا تو اُسے اپنے دوسرے ابنائے جنس کی طرح ایک دن مرنا ہے۔ یا اپنے لئے موت کا یقین رکھکر اس سے بھاگنے اور بچنے کی کوشش کرے اور یہی دو صورتیں ہیں جو آپ کو مذہب کا خیال دلاتی ہیں۔ پھر چونکہ اُسے موت سے بچنے کا یقین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مضطر و پریشان ہو کر مذہب کی جستجو میں مشغول ہوگا۔ اور اب اس کے لئے صرف یہ تلاش باقی رہجائے گی کہ مذہبی عقائد میں سے کون اس کے دل کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

باقی ~~~~~~~~ باقی

سید مقبول احمد بی اے

لغت اسلامی

مرتبہ سید حامد حسین رضوی - (علیگ)

جلد اول طیار ہوگئی ہے جسمیں صرف ثا تک تمام وہ الفاظ معہ مکمل تشریح و تفسیر کے درج کئے گئے ہیں، جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہبی، اقتصادی، جغرافی، تاریخی، علمی و معاشری لٹریچر سے ہے۔ نہایت مفید و ضروری کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ۶ ملنے کا پتہ:۔ منیجر "نگار" لکھنؤ

انتہائی رعایت

دو کیرٹ گولڈ فلیٹڈ رسٹواچ اپنی خوبی میں پچاس روپے کی گھڑی سے مقابلہ کرتی ہے ہر موسم میں سچا ٹائم بتاتی ہے کاریگر کو اس کی مشین پر بہت ناز ہے۔ از حد خوبصورت و بہت پائدار ہے۔ کاریگر کی جدید ساخت ہے۔ اسوجہ سے قیمت کم یعنے علاوہ محصول وغیرہ سات روپیہ (مے)

بجل سلو کمپنی کی یہ گھڑیاں وقت کی سچائی میں کافی شہرت پا چکی ہیں۔ گھڑی ساز کا منہ دیکھنا بھی نہیں جانتیں ہمیشہ اپنا کام وفاداری سے کرتی ہیں۔ قیمت علاوہ محصول وغیرہ پانچروپے (للعہ)

الارم کی گھنٹی اسقدر زبردست ہو کہ گھر والوں کیا ہمسایہ بھی بیدار ہوجائے وقت کی سچائی میں ہزاروں سند یں پا چکا ہے کیونکہ کاریگر نے اس کی مشین نرالی قسم کی بنائی ہو۔ اسکے چلنے کے تین سال تک کے ہم ذمہ دار ہیں۔ قیمت علاوہ محصول وغیرہ (للعہ)

چاروں اشیار کی قیمت صرف نوروپے آٹھ آنے

ان چاروں اشیار کی قیمت بلکہ اکیس روپے ہوتی ہو لیکن ہم ہول سیل فو لیر (تھوک فروش) ہیں اس وجہ سے جو صاحب چاروں اشیار ایک دم طلب کرینگے ان کو صرف نوروپے آٹھ آنہ میں روانہ کیجائینگی اور محصولڈاک و پیکنگ بھی ہمارے ذمہ ہوگا۔ ایک یا دو اشیار کے لئے کوئی رعایت نہیں ۔۔

ملنے کا پتہ نیو کمپنی اینڈ کو واچ کلاک مرچنٹس بازار چاندنی چوک ۱۸ دہلی

چنگاری

(فسانہ)

(بسلسلۂ ماسبق)

:(۶):

یوسف کا اعادۂ مرض ہر چند نہ زیادہ شدید تھا نہ زیادہ طویل، لیکن تاثرات ونتائج کے لحاظ سے یوسف کی حیات کے لئے ایک ایسا نقطۂ انحراف (Turning point) اپنے اندر رکھتا تھا کہ اُس کو بھلا دینا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

اس سے قبل مس ہلن نے تیمار داریاں ایسے عالم میں صرف کی تھیں کہ یوسف بالکل بیہوش تھا، لیکن اس مرتبہ یوسف ہوش میں تھا، اسکا دماغ صحیح تھا اور اگر ایک طرف وہ مس ہلن کی جانفشانیوں کو دیکھ کر خاموشی کے ساتھ نہایت گہرا اثر قبول کرتا جاتا تھا، تو دوسری طرف مس ہلن بھی سمجھتی جاتی تھی کہ اس مرتبہ پہلے کی طرح یوسف کی خدمت، کسی بت کی پرستش نہیں ہے بلکہ ایک ایسی اثر پزیر چیز کو ہاتھ میں لینا ہے جو ہر لمس کے نقش کو قبول کر لینے والی ہے۔ اول مرتبہ جو کچھ اس نے کیا محض انسانی فرض شناسی کے احساس پر مبنی تھا۔ لیکن اس مرتبہ جو کچھ وہ کر رہی تھی یکسر نسائی ایثار تھا جس کے لئے دنیا نے ہمیشہ بڑی سی بڑی قربانی گوارا کی ہے۔

عورت کی صحیح فطرت کا اندازہ کرنا ہو تو اُسے اس وقت نہ دیکھو جب وہ عہد تمنا سے گزر رہی ہو، انتظار کرو یہاں تک کہ وہ مقصود کو پالے یا اس سے مایوس ہو جائے پھر اگر اس کا مدعا صرف دوسرے کے اندر جذبۂ پرستش پیدا کر نیکی حد تک ختم ہو جائے تو سمجھ لو کہ اس کے بعد وہ انتقام پر آمادہ ہوگی اور پھر یہ انتقام ایسا ہی شدید ہوگا جیسا وہ جذبہ جو مایوسی کے عالم میں اسے اپنے آپ کو ہلاک کر دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔

یوسف، جس نے اسوقت تک نسائی فطرت کا بالکل مطالعہ نہ کیا تھا اس دوران میں صرف اس قدر سمجھنے میں کامیاب ہوا۔ کہ عورت بھی قدرت کی غیر ضروری پیداوار نہیں ہے اور مرد کی زندگی کی بعض خستگیاں ایسی ہیں جنھیں عورت ہی کا نرم ونازک لمس دور کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اب بھی اس حقیقت سے آگاہ نہ تھا کہ عورت سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرنے کا عزم ایک شدید ترین جرم ہے اور فطرت کبھی نہ کبھی اس کا انتقام لے ہی لیتی ہے۔ مس ہلن سے اس کی پہلی ملاقات بالکل وہی نوعیت رکھتی تھی جو ایک اجنبی کیساتھ ہوا کرتی ہے اور اس کے بعد اس نے ایک دوستی کی سی صورت اس کو دینا چاہی تھی، لیکن مس ہلن جس کے سامنے یوسف کا وجود ایک ایسا معمہ تھا جس کے حل نہ کر سکنے کو وہ اپنی توہین خیال کرتی تھی، کسی اور فکر میں تھی اور آخر کار وہ اپنی فکر تفضول میں کامیاب ہو کر رہی، یہاں تک کہ جس وقت یوسف بیماری سے اٹھا ہے تو وہ اپنی زندگی کو مس ہلن ہی کا عطیہ سمجھکر اُٹھا اور اس کی غیور طبیعت اس خلش سے بے چین ہونے لگی کہ وہ کیونکر اس احسان کا اعتراف کر سکتا ہے۔

یقیناً اول اول اخلاق ہی کی دنیا میں یوسف کو ہلن سے تعلق پیدا ہوا، لیکن وہ غریب بے خبر تھا کہ عورت سے تعلق ہونے کی کیفیت دنیا میں ایک ہی ہے اور اس کو دائرہ کے جس نقطہ سے بھی شروع کیا جائے اسے پہونچنا اسی مرکز تک ہے جہاں مرد اپنے آپ کو بالکل بیدست و پا محسوس کرنے لگتا ہے۔

یوسف بالکل صحیح و توانا ہو گیا، وضع و معاشرت بدل گئی، مشاغل میں بھی شان امارت پیدا ہونے لگی، اور رفتہ رفتہ وہ اسی سطح پر آگیا جہاں مرد ایک عورت کے لئے سراپا نمائش نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن سب سے زیادہ حیرتناک امر یہ ہے کہ اس نے آخر کار یہ بھی محسوس کر لیا کہ زندگی خواہ کسی چیز کا نام ہو، لیکن زندگی کا لطف عبارت ہے عورت سے اور وہ عورت اس کیلئے سوائے ہلن کے کوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔

اصولاً وہ اس سے واقف تھا کہ عورت کے سامنے کیونکر جذبۂ محبت پیش کیا جاتا ہے، اس نے بہت سے نسانے پڑھے تھے اس نے دوران تعلیم میں متعدد ناولوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اور اس لئے جہاں تک 'نظریہ' کا تعلق ہے وہ اس سے خوب آگاہ تھا، لیکن جب اس پر عمل کرنے کا وقت آیا، جب سوال خود اپنے دل کا پیش ہوا، تو اس کی تمام آگاہیاں بیکار ثابت ہوئیں، اور کسی طرح اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ دل کا یہ کانٹا کیونکر زبان سے نکالا جائے۔

باوجودیکہ مس ہلن، یوسف کے لئے سراپا توجہ تھی، یکسر انعطاف و التفات تھی، لیکن یوسف جس وقت اپنے آپ کو دیکھتا تھا، اپنے تمام حالات پر غور کرتا تھا تو اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا، کیونکہ جس زندگی کا عادی اس کو مس ہلن نے بنا دیا تھا اب وہ ایک نشہ کی سی تکلیف رکھتی تھی اور یوسف کی قدرتاً یہی خواہش ہونی چاہئے تھی کہ وہ اس لطف میں دوام پیدا کرے، لیکن جب وہ یہ خیال کرتا تھا کہ مس ہلن کیوں اپنی زندگی اس کے ساتھ وابستہ کرنے لگی، اس میں کیا ہے جس کے لئے وہ اپنی وسیع دنیا کو ترک کر کے مجبور و پابند ہو جائے گی، تو ساری تعمیر خیال خاک میں ملجاتی تھی اور وہ متحیرانہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا۔

مس ہلن اس کے تمام جذبات سے آگاہ تھی اور کیوں نہ ہوتی جب کہ وہ خود اس کے پیدا کئے ہوئے تھے، لیکن اب مشکل سے یوسف کو کوئی موقع ایسا دیتی تھی کہ وہ اظہار تمنا کر سکے، اب اس کی تمام باتیں نہایت سخت بے لطف مادیات کے متعلق ہوا کرتیں، یا خشک سیاسیات، اس کا موضوع سخن ہوتا۔ یوسف حیران تھا کہ یہ انقلاب اس میں کیوں ہو گیا۔ ایک وقت تھا کہ وہ سوائے حسن و عشق، نظریۂ شعر و شاعری، اصول فنون لطیفہ تجزیۂ جذبات جنسی کے اور کوئی بات ہی نہ کرتی تھی۔ اس حال میں کہ وہ گھبرا گھبرا کر بھاگ اٹھتا تھا یا اب وہ وقت آیا کہ اسے تمنا رہتی تھی کہ مس ہلن کوئی ایک ہی جملہ زبان سے ایسا ادا کر دے کہ اس کو کسی لطیف بحث کے چھیڑنے کا موقعہ ملے لیکن اس میں کامیاب نہ ہوتا۔

یہاں تک کہ معمولاً جب صبح کو وہ گلدستہ سامنے لا کر پیش کرتا تو بجائے اس کے کہ وہ پھولوں کی خوشنمائی کا ذکر کرتی، نباتات کے متعلق مسٹر بوس کے انکشافات سے بحث کرنے لگتی اور ایسا خشک چہرہ بنا کر کہ یوسف کو سوائے خاموش سنتے رہنے کے کوئی چارہ نہ ہوتا ـــــ ایک خنک شب ماہ میں ساحل کے قریب قریب یوسف کشتی کھیتا ہوا چلا جا رہا تھا، ہارسنگھار اور

کروندے کی جھاڑیوں سے خوشبو نکل نکل کر پھیل رہی تھی، ایک عشق انگیز روشن سکوت سطح آب اور تمام فضا پر طاری تھا کہ دور سے بانسری کی آواز آئی، مس ہلن بانسری کی عاشق تھی۔ یوسف نے اس خیال سے کہ اس وقت ان کیفیات کا اجتماع یقیناً ایک کامیاب سفارش ثابت ہوگا۔ اُس نے بہت جراٴت کرکے کہا کہ "آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس وقت کیسا سحر ٹپک رہا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذرہ ذرہ عشق ...." ۔ وہ یہ فقرہ پورا بھی نہ کرپایا تھا کہ مس ہلن نے چونک کر کہا۔ "مسٹر یوسف، آج کا اخبار آپ نے دیکھا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتی کہ مصر کے ساتھ برطانیہ کا موجودہ طرز عمل کیونکر قابل ستائش سمجھا جاسکتا ہے، حیرت ہے کہ وہاں کی وزارت کیوں نہیں بیدار ہوتی۔ اور وہاں کی رعایا کب تک اپنے حقوق کی پامالی کو گوارا کرتی رہیگی"

اس وقت یوسف کی وہی حالت ہوئی جیسے دفعتہً کسی کا گلا گھونٹ کر خاموشی کے ساتھ تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا جائے مجبوراً اُسے وہ "ذرہ ذرہ کا عشق" ترک کرنا پڑا، لیکن کچھ سوچکر تھوڑی سی خشونت کیساتھ بولا "جی ہاں مصر کی مجبوریوں سے میری مجبوریاں بھی کم نہیں لیکن فرق یہ ہے کہ اُن کا ذکر کیا جاتا ہے اور اِن کو فراموش - خدا جانے دنیا کے کتنے دردناک واقعات ایسے ہیں جو فسانہ بننے سے پہلے ہی محو کردیے جاتے ہیں"۔

بات سے بات پیدا کرنے کی ذہنیت یوسف میں کبھی نہ تھی لیکن جہاں اور بہت سے انقلاب اس کی زندگی میں ہوئے، یہ بھی ایک تغیر رونما ہوا اور چونکہ سلسلۂ گفتگو میں کسی کی طرف سے ایسی ذہنیت کا ظاہر ہونا ہمیشہ مخاطب کو مغلوب کردیتا ہے، اس لئے مس ہلن نے پھر اس کو ٹالنا چاہا اور زیادہ سنجیدگی کے ساتھ بولی کہ "ذاتی وانفرادی مجبوری کا افسانہ بننا کوئی اچھی بات نہیں ہے اور نہ دنیا کو فرصت وضرورت کہ اسے سنے، آپ کے ایک ایک کاشتکار کا دل اس لحاظ سے ایک غمکدہ ہوگا اور خدا جانے کتنی نزالہ باریوں کے زخم وہ اپنے سینے میں لئے ہوئے ہوگا، لیکن کیا آپ پر کیا الزام اگر آپ اس سے بے خبر ہیں، .... بہت دیر ہوگئی اب آپ جلد واپس چلئے، مجھے ایک نہایت ضروری خط لکھکر اسی وقت روانہ کرنا ہے"۔

اس وقت یوسف کی مجبوری دبیچارگی اس حد تک پہونچ گئی تھی جس کے بعد ردعمل شروع ہوکر انسان از سرِ نو اپنے اندر جراٴت وجسارت محسوس کرنے لگتا ہے، وہ سمجھتا تھا کہ جو کچھ کہنا ہے، اسی وقت کہدینا چاہئے، ورنہ پھر موقعہ ملنا دشوار ہے۔ لیکن جب مس ہلن کے موجودہ احتراز کو دیکھتا تھا تو پھر اس کا نفس ملامت کرنے لگتا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ کشتی کا رخ پھیر کر واپس جارہا تھا اور ان تمام حالات پر غور کرتا جاتا تھا کہ گھاٹ آگیا۔ وہ کشتی سے اترا اور مس ہلن کو اُتارنے کے لئے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ یہاں تک جو کچھ ہوا وہ یوسف کے عالم ہوش کی باتیں تھیں، لیکن جب مس ہلن کا نرم ونازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا تو وہ بالکل بے اختیار ہوگیا اور قبل اس کے کہ مس ہلن اپنا ہاتھ علحدہ کرتی، یوسف نے اسی جگہ دوزانو ہوکر پیام دل کہدیا۔

مس ہلن نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بولی "یوسف صاحب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں تو آپ کو ایک غیر معمولی انسان سمجھتی تھی، مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ بھی آخرکار اسی سطح پر آگئے جہاں انسان بجائے روح کے صرف گوشت پوست کی نمائش کرنے لگتا ہے"۔

یوسف "اگر میں واقعی کسی ایسی سطح پر آگیا ہوں، جو آپ کے نزدیک پست ہے تو اس کا الزام مجھ پر نہیں ہے آپ نے میری ساتھ

وہ احسان نہیں کیا جس کی یاد میرے سے محو ہو سکے۔ پھر اب میں اس کی عوض میں سوائے اس کے کیا کر سکتا ہوں کہ اپنی زندگی کو جو حقیقتاً آپ ہی کی بخشی ہوئی ہے، آپ کے قدموں پر ڈال دوں۔"

مس ہلن "میں نے جو کچھ کیا آپ اسے احسان سمجھیں یا کچھ اور لیکن میں تو اسے ایک فرض انسانی سمجھتی ہوں، اور اس لئے اس کا کوئی عوض قبول کرنے کے لئے طیار نہیں۔ علاوہ اس کے یوں بھی یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ منت پذیری کا ذکر اس طرح کیا جائے گویا آپ نے خود کوئی احسان مجھ پر کیا ہے۔ اگر آپ ہی کے یقین و اعتقاد کے مطابق میں نے کوئی احسان کیا ہے تو اس کا عوض یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ اس کے عوض میں، مجھی کو مجھ سے چھین لیں۔ جس وقت تک ہیئت اجتماعی کے قانون میں مرد کو کچھ بھی مرجح درجہ حاصل ہے، اس وقت تک میں یا کوئی ذی حس عورت نکاح کی توہین کو گوارا نہیں کر سکتی۔ فطرت نے ہر چیز کو آزاد پیدا کیا ہے اور آزادی کو قایم رکھنا ہر ذی حیات کا فطری حق ہے، دنیا میں پابندی کا خیال صرف ایک فریب ہے، اور کسی ایک حالت پر قائم رہنا ارتقاء کا دشمن نسیم آزاد ہے، نکہت آزاد ہے، آبشار آزاد ہے، اور ہر وہ چیز آزاد ہے جو لطیف ہے، پہاڑوں کے جمود میں ہیبت ہو تو ہو لیکن لطافت مفقود ہے۔" وہ یہ باتیں کرتے کرتے مکان تک پہونچ گئی اور جب یوسف رخصت ہونے لگا تو اس نے یہ کہکر کہ "کل صبح کو میں چلی جاؤنگی" دروازہ بند کر لیا اور یوسف کو مبہوت و متحیر چھوڑ گئی۔

(۷)

مس ہلن کو گئے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں یوسف کی زندگی نے جو تغیرات قبول کئے وہ نہایت عجیب و غریب تھے۔ مشاغل کاشتکاری کے ساتھ ظاہری وضع و معاشرت کی سادگی تو اس سے قبل ہی رخصت ہو چکی تھی لیکن مس ہلن کے جانے کے بعد قلب و دماغ کا توازن بھی درہم برہم ہو گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس میں ایک نہایت خطرناک انتفاعیت (utilitarianism) کا ذوق پیدا ہو چلا ہے۔ مس ہلن کی معیت اور اس کی گفتگو نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک اشتعال پذیر مادہ کیساتھ آگ کی چنگاری کرتی ہے اور اس کے جذبات کی وہ حالت ہوئی جیسے تند شراب سر بند مینا کو توڑ کر باہر ابل پڑے

گزشتہ صحبت کے ختم ہونے کے بعد کامل پندرہ روز تک اس نے غور کیا کہ آیا وہ اپنے جذبات کو ضبط کر سکتا ہے یا نہیں اور جس نتیجہ پر پہونچا وہ یہ نہ تھا کہ ضبط ممکن نہیں بلکہ اس کا خطرناک پہلو یہ تھا کہ ضبط کی ضرورت بھی نہیں ہے، اسی کے ساتھ مسئلہ آفرینش، نظام تمدن، مذہب و اخلاق، رابطۂ نکاح، فلسفۂ حسن و عشق، اور خدا جانے کن کن مسائل پر غور کیا۔ اور آخر کار پورے وثوق کے ساتھ اس کے دماغ نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ:۔

۱ قدرت پیدا کرنے کے بعد نہ مخلوق کے اخلاق کی ذمہ دار ہے اور نہ مخلوق پر قدرت کا کوئی خاص حق ہے۔

۲ تمدن کا قانون نام ہے اس ظلم کا جو وہ افراد پر روا رکھتی ہے۔

۳ مذہب ایک جنون ہے جس سے صرف سلطنتیں قائم کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

۴۔ نکاح ایک لایعنی پابندی ہے جس کے ذریعہ سے تمایل جنسی کو برباد کیا جاتا ہے۔

۵۔ حسن و عشق مسمی ہے صرف شباب سے فائدہ اٹھانے کا۔

۶۔ غایت حیات سوائے اس کے کچھ نہیں کہ شباب کو اس طرح بسر کر دیا جائے کہ شیب میں اس کے اعادہ کی حسرت باقی نہ رہے

جب تک اس کا خیال اس حد تک نہ پہونچا تھا، اس کی روح مس ہلن کے لئے حزین وملول تھی، لیکن جب اس نے اصول زندگی یہ مقرر کر لئے تو اس کی روح اس فشار سے آزاد ہو گئی اور اب اس کا تمام حزن و ملال آگ بنکر اس کے ریشہ ریشہ میں دوڑ گیا۔ اب وہ یکسر ہیجان تھا، اس کے خون میں ایک ناقابل ضبط شہاب دوڑ رہا تھا اور اس کے سر میں ایسا نشہ پایا جاتا تھا جو صرف قوت بہیمہ کو ابھار سکتا ہے۔

اس نے تمام احباب کو اپنی زندگی کے اس تغیر سے آگاہ کیا اور مس ہلن کو بھی ایک تحریر روانہ کی جو الفاظ کے لحاظ سے بہت مختصر لیکن معنی کے لحاظ سے نہایت بسیط تھی اور غالباً اس کی زندگی کا یہی پہلا ادبی کارنامہ تھا اس نے لکھا۔

"پہلے اگر مجھے اس کا افسوس تھا کہ نام کے لحاظ سے میری صورت کیوں اچھی نہیں ہے، تو آج میں اس تغیر پر مسرور ہوں کہ اب میری فطرت بھی یوسف کی طرح نہیں رہی۔ کیا یہ فخر کم ہے کہ جو کنعان کے حسین یوسف سے نہ ہو سکا، آج خلد آباد کا زشت رو یوسف اس کے کرنے پر قدرت رکھتا ہے، آپ نے دیکھا فطرت جب بخیل ہوتی ہے تو کس قدر اور فیاضی پر آمادہ ہو جاتی ہے تو کتنی۔ کس قدر بے عقل ہیں وہ لوگ جو دنیا کے ہنگامہ میں نظام و اصول کی جستجو کرتے ہیں۔ اخلاق و مذہب کا معیار قائم کرتے ہیں، حالانکہ موت ہر وقت اعلان کرتی رہتی ہے کہ جو کچھ کرنا ہو کر لو، زندگی دوبارہ ملجائے تو ملجائے لیکن جوانی پھر نہیں مل سکتی۔ کس قدر خوش نصیب تھے وہ لمحے جب اول اول آپ نے میرے اندر یہ احساس پیدا کیا، میری سوئی ہوئی فطرت کو بیدار کیا۔ میں سمجھتا تھا انسان پیدا ہوا ہے صرف کام کے لئے اور رات دن خستہ رہتا تھا، آپ نے بتایا کہ وہ صرف ہنسنے اور کھیلنے کے لئے بنایا گیا ہے اور اب میں بجائے خستگی کے خاص نشاط اپنے اندر پاتا ہوں۔ اب تو غالباً آپ کو میرے ملنے سے احتراز نہ ہوگا کیونکہ اگر آپ تیتری کی طرح ہر وقت آزاد رہنا ہی پسند کرتی ہیں، تو میں بھی اسی کو پسند کرتا ہوں کہ اس کا تعاقب کیا جائے لیکن صرف اس لئے کہ جب ہاتھ آجائے تو تھوڑی دیر تک چٹکی میں اس کا تلملانا دیکھ آزاد کر دیا جائے میں اس خط کے جواب کا انتظار نہ کرونگا، پرسوں خود یہاں سے روانہ ہو کر آپ کی معیت میں سحر بنگالہ کی قوتوں کا امتحان کرنے کے لئے پہونچتا ہوں۔

یوسف سمجھتا تھا کہ مس ہلن اس کے اس تغیر پر بہت مسرور ہوگی اور اس کی آغوش اس کے لئے کھلی ہوگی، لیکن اس کے حیرت کی انتہا نہ رہی، جب کلکتہ پہونچنے کے بعد اس کو بجائے مس ہلن کے اس کا ایک خط ملا جس میں اس نے بہت افسوس ظاہر کیا تھا اور ایک نہایت اہم ضرورت سے دارجلنگ چلے آنے کی معذرت کی گئی تھی۔

اس نے فوراً دارجلنگ تار دیا اور اسی وقت وہاں روانہ ہوگیا۔ لیکن جب وہاں پہونچکر ہوٹل کے منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دو گھنٹہ قبل مس ہلن ہوٹل چھوڑ چکی ہیں لیکن اس کے نام ایک تحریر دے گئی ہیں اس میں لکھا تھا:۔

"تیتری کا تعاقب آسان نہیں، جنگل میں اس کو تلملاتے ہوئے دیکھنا یقیناً پر لطف منظر ہے، لیکن آپ کو نہیں معلوم کہ جس تیتری پر آپ قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں اس تک دسترس حاصل کرنے کے پہلے سر دینا ضروری ہے"۔

یہ تحریر پڑھ کر جو حالت یوسف کی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص اپنی جگہ کر سکتا ہے، وہ غالباً اس خط کو دیکھ کر فوراً واپس...... جاتا اگر وقت ہوتا لیکن، اس نے کچھ تو اس خیال سے کہ انتظار کرنا ضروری ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ ہوٹل کے لوگ اس کو سبک نہ سمجھیں، حکم دیا کہ اسباب کس کمرہ میں پہونچا دیا جائے اور خود بھی وہاں پہونچکر اس فکر میں مستغرق ہوگیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے

باقی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ باقی

نیاز

سفرنامۂ اندلس

مرتبہ عالیجناب قاضی ولی محمد صاحب سکریٹری اسٹیٹ کونسل

جسمیں کہ مقصد دیار و امصار۔ قصبات و حصون۔ میدان جنگ وغیرہ کے چشم دید تاریخی حالات مصنف ممدوح الشان نے سنہ ۲۳ء میں طولانی سیاحت کر کے قلمبند کئے ہیں اور جسمیں قرطبہ۔ غرناطہ۔ اشبیلیہ۔ بطلیوس۔ بلنسیہ۔ مرسیہ۔ برشلونہ۔ طلیطلہ۔ شاطبہ۔ وادی الحجارہ جبل طارق۔ جزیرۃ الخضرا۔ ارجونہ۔ سرقسطہ۔ قلعہ رباح۔ طنجہ۔ قصر الصغیر وغیرہ کے مفصل حالات معہ یکصد تصاویر عکسی و نقشہ جات آثار اسلامی مثل مساجد۔ قلعہ جات پل۔ محلات۔ منارہ جات۔ پن چکی۔ زنانہ و مردانہ لباس مسلمانان اندلس۔ زیورات۔ الحمرا۔ القصر الطارق۔ قصر جعفریہ۔ مسجد قرطبہ۔ مدینہ زہرا قابل دید ہیں۔

کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ضخامت ۳۸۰ صفحات۔ عبارت دلچسپ و دلکش اور حالات تاریخی و جغرافیائی میں نہایت صحت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر ایک روز کے مطالعہ کے بعد ناپسند ہو تو واپس کر دینے پر بعد منہائی محصول ڈاک باقی قیمت واپس کر دیجاتی ہے قیمت آٹھ روپے کلدار محصول ڈاک وغیرہ چودہ آنے۔ اس قدر تصاویر آج تک کسی اردو کتاب میں شائع نہیں ہوئیں۔

مصنف ممدوح الشان سے طلب کیا جا سکتا ہے

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(ملاحظہ ہو نگار ماہ فروری سنہ ۱۹۲۸ء)

اسلامی ہندوستان کی مضبوط ترین جائے پناہ شمال مغربی حصہ ہے اور وہاں اسلام کی حالت مایوس کن نہیں ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تباہی کے قریب آگیا ہے۔ ذہنی لحاظ سے وہ اپنے ہندو ہمسایوں کے مساوی ہیں۔ مگر اخلاقی لحاظ سے وہ ان سے اعلیٰ ہیں اور وہ ابھی تک یہ بات بھولے نہیں کہ زمانۂ حال تک سلطنتِ ہندوستان کا انتظام ان کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اپنے زوال کے متعلق یہ رائے نہیں رکھتے کہ وہ اس کے مستحق تھے یا یہ کہ وہ لاعلاج ہے۔ تاریخی حیثیت سے وہ تاتاری، ایرانی اور افغانی فاتحین کی اولاد ہیں جنھوں نے مختلف زمانوں میں شمال مغربی حصہ سے ہندوستان پر حملے کئے، یا ان نومسلموں کی اولاد ہیں جو راجپوت سے مسلمان بنائے گئے تھے۔ چند شریف گھرانوں کے سوائے اُن کی نسل خالص نہیں رہ گئی لیکن ان کے مولد کی روایات جوں کی توں قائم ہیں اور یہ ان کی کمزوری اور طاقت دونوں کا باعث بنی ہوئی ہیں، طاقت تو اس لئے کہ ان کے ذریعہ وقار اور عزت کا ایک معیار قائم ہو جاتا ہے جو ہر سوسائٹی کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے اور کمزوری اس لئے کہ ان کی وجہ سے وہ زندگی کے معمولی پیشوں کو حقارت سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں ؞

شمالی ایشیا سے جو اسلامی اقوام اٹھی ہیں ان کی عام برائی فتح کا غرور ہے اور ہندوستان کے مسلمان اس لحاظ سے مستثنیٰ نہیں کئے جا سکتے۔ مغلوں نے کبھی تجارت کی جانب رغبت نہیں کی بلکہ وہ آباد ہونے کے بعد سرکاری ملازم ہو گئے خواہ وہ ملازمت شہری ہو یا فوجی۔ ان کی نسلوں میں اب تک یہی غرور چلا آرہا ہے۔ ہندوستان میں ان پر مصائب کے پہاڑ یکے بعد دیگرے ٹوٹے۔ مرہٹوں کی لڑائیوں سے تنگ آکر انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے اتحاد کر لیا اور اس طریقہ سے سلاطین مغلیہ موخر الذکر کے زیر اقتدار آگئے اور بالآخر جب دہلی کی شہنشاہیت اس میں جذب ہو گئی تو حکومت کے اختیارات تمام و کمال مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں رہے، یہ تبدیلی یکلخت وجود میں نہیں آئی بلکہ آہستہ آہستہ جیسا کہ جدید نظام کا نفاذ ہوتا رہا ہے۔ جن اشخاص پر سب سے پہلے اس کا اثر پڑا وہ مالکان اراضی تھے۔ ایک خاص قانون اراضی کے ذریعہ تمام اصحاب جائداد سے ان کے قبالے طلب کئے گئے اور مسلمان جن میں اکثروں کے پاس تحریری اجازت نامے نہ تھے، اپنی وسیع جائدادوں سے محروم کر دئے گئے اور اس طرح قلاش رہ گئے۔ فوجی ملازمتوں میں اُن کیلئے میدان موجود نہ تھا اِس لئے کہ بہت بڑی حد تک دیسی افواج کو اڑا دیا گیا تھا۔ اور سب سے آخر میں چونکہ اس قانون کے ذریعہ سرکاری زبان فارسی سے انگریزی قرار دیدی گئی تھی اس لئے شہری ملازمتوں میں بھی ان کی نمایاں حیثیت بالکل جاتی رہی۔ مسلمان اب تک ہندوؤں سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ بڑھے ہی ہوئے تھے کیونکہ اردو انکی مادری زبان تھی اور فارسی ان کی کلاسیکل زبان تھی۔ لیکن

انگریزی میں وہ بہت پیچھے تھے۔ جو تجارتی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور اس لحاظ سے تمام تعلیم یافتہ ہندوؤں کی وہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ مزید براں انگریزی کی تحصیل اسکولوں کے سوائے اور کہیں ممکن نہ تھی اور مسلمان اپنے بچوں کو وہاں بھیجنے کے یوں مخالف تھے کہ اس سے لامذہبی پھیلتی ہے۔ لہذا ان کی ملازمت کے ذرائع ہر طرف سے محدود ہو گئے اور اس کا قدرتی نتیجہ افلاس کی شکل میں نکل رہا ہے جو روز بروز ترقی پر ہے۔ ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت نے جس نے اودھ اور دہلی میں خاص اسلامی صورت اختیار کر لی تھی، انگریزی حکومت کو مسلمانوں سے کلیتہً بدظن کر دیا جس کا خمیازہ انہیں بعد میں مادی نقصان میں اٹھانا پڑا +

ساتھ ہی یہ مسلمہ امر ہے (اگرچہ مجھے اس کی پوری پوری تشریح معلوم کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا) کہ شمالی ہندوستان کے مسلمان بلحاظ تعداد بہت سرعت کے ساتھ ترقی کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ اسکی وجہ یہ ہو کہ ادنیٰ ذاتوں کے ہندو مسلمان بن جاتے ہیں یا ممکن ہے کہ دوسرے اسباب ہوں، لیکن یہ یقینی امر ہے کہ اگرچہ قدیم شمار کے حساب سے ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد تقریباً تین کروڑ تھی اور حال میں ڈاکٹر ہنٹر نے ان کا اندازہ چار کروڑ کیا ہے لیکن آخری مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ۵ کروڑ ہے اگرچہ ہندوستان کی عام مردم شماری میں اسی نسبت سے اضافہ نہیں ہوا۔ لہذا اب ہم شمالی ہندوستان میں جس غیر اطمینان بخش صورت حالات سے دوچار ہو رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کی آبادی روبترقی ہے اور دوسری طرف وہ کم خوشحال ہوتے جا رہے ہیں دوسرے یہ کہ یہ قوم اگرچہ فطری طور پر نظم و نسقِ سلطنت کے قابل ہے تاہم اسے انتظام ملک میں شریک نہیں کیا جا سکتا، تیسرے یہ کہ یہ وہ قوم ہے جو اپنے مصائب کو ان غیر موافق حالات کا نتیجہ سمجھنے میں حق بجانب ہے جنھیں امپیریل گورنمنٹ نے ان پر عائد کر دیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ شمالی ہندوستان کے مسلمان غیر مطمئن حالت میں ہیں اور بےچین ہیں اور واحد سوال یہ رہ جاتا ہے کہ انکی طاقت جس میں تباہی کی مایوسی کا احساس بھی شامل ہے کس مصرف میں آئیگی۔ اس کے دو مصرف ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس سے اپنی اور عام بھلائی متصور ہو یا وہ جس سے اپنا اور عام نقصان ہوتا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ امر ہندوستان کے موجودہ حکمراں کے حیطۂ اختیار میں ہے کہ وہ مسلمانوں کی طاقت کو اول الذکر مصرف میں خرچ کریں اور مؤخر الذکر مصرف سے ان کی توجہ کو ہٹا دیں +

جو اصحاب ہندوستان میں امن و امان قائم رکھنے کے ذمہ دار ہیں، انہیں معلوم ہوگا کہ خود ملک کے اندر اور اُس کی سرحد پار ایسے اثرات کام کر رہے ہیں جو اس امن و اماں کے مخالف ہیں۔ مجھے روسی حملہ کا خطرہ نہ کبھی رہا ہے اور نہ میں اس کا قائل ہوں اگر اس حیثیت سے نگاہ ڈالی جائے کہ روس ہندوستان کا دشمن ہے، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے ضرر دشمن ہے اور رہیگا۔ اور میں ہندوکش یا اصلی سرحد تک اس کی آمد کو اطمینان کیساتھ دیکھتا بشرطیکہ یہ ناممکن ہوتا کہ وہ یہاں دوست کی حیثیت سے کبھی نہیں آ سکتا۔ لیکن دوست کی حیثیت سے میں اس سے خائف ہوں۔ اگر ہماری خود غرضانہ حکومت کے نظام میں (جو ہندوستان کے فائدہ کے بجائے خود ہمارے فائدہ کے لئے قائم ہے) کسی قسم کی تبدیلی نہ کی گئی یا اگر ہم باشندگانِ ہند کو بالآخر سیلف گورنمنٹ (سوراج) کا یقین دلانے سے انکار کرتے رہے جس کے باعث وہ اطمینان کے ساتھ اپنی امیدوں کے پورا ہونے کے موقع کا انتظار کرنے کے قابل ہو جائیں گے

اگر ہم ان کے ساتھ محکوم دشمنوں کا سا سلوک روا رکھیں گے یا انہیں اپنے کام کے لئے غلام بنا رکھیں گے۔ یا ایسے اشخاص کے طور پر
جو حقوق سے معرا ہوں، تو یہ یقین کر لینا چاہئے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر تمام بیرونی دنیا ہندوستان کی دوست بن جائیگی اور
روس چونکہ سب سے قریب ہے، اس لئے وہ سب سے بڑھکر دوستانہ روش اختیار کرلیگا +

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ حالات میں زار کی حکومت بہت کچھ پیش کر سکتی ہے اور اگر انکار کرنے سے بیشتر باشندگان
ہند اسپر اچھی طرح سے غور و خوض کریں تو یقیناً وہ معاف کئے جا سکتے ہیں، روسی مشرقی ہے اور اغلب گمان یہ ہے کہ غیر ہمدرد سرکاری
انگریز کے مقابلہ میں اس کا آقا بن جانا کم نفرت انگیز ہوگا۔ لیکن یہ بھی یقین سے بہت بعید ہے کہ ہندوستانی توقعات کے روبرو وہ
اپنے تئیں آقا کے طور پر پیش کریگا۔ ممکن ہے کہ وہ اتحادی کی حیثیت سے جلوہ گر ہو اور یہ کہے کہ میں تم کو انگریزی مالی نظام کے
مہلک پنجہ سے رہائی دلانے آیا ہوں اور یہ کہ میں آزادی، کفایت شعاری اور مالی ترقی کا حامی رہونگا کون کہہ سکتا ہے کہ روس کسی جدید
تجارتی معاہدہ کے بدلہ میں ہندوستان کو کامل ہوم رول عطا نہیں کریگا اور اور اس طریقہ سے ہماری محبت کو زائل نہیں کریگا؟ ہندوستان
کو اس امر کی ترغیب دینا کہ اسے مجوزہ تبدیلی سے فائدہ پہنچیگا کچھ مشکل نہ ہوگا اور انگریز ہونے کی حیثیت سے مجھے اس بات کا پورا یقین
ہے کہ ہر امر میں اسے نقصان رہیگا۔ بہر صورت یہ ممکن ہے کہ لوگ یہ سمجھ کر کہ اگر برا سے برا بھی نتیجہ نکلا تو موجودہ بدترین حالت سے تو
برا نہ ہوگا۔ تبدیلی کی خواہش کو اچھی نظر سے دیکھنے لگ جائیں +

اسوقت اگر کوئی قوم ایسی ہے جسپر اس قسم کے دلائل کا سب سے زیادہ اثر ہو سکتا ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ موجودہ نظام اُن کیلئے
تباہی انگیز ہے حالانکہ سرحد سے تھوڑے ہی فاصلہ پر اُن کے بھائی بند ہیں جو ابھی تک حکومت کر رہے ہیں، اس سے بڑھکر اور زیادہ
قدرتی امر کونسا ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے امداد کے متوقع ہوں یا اُن سے بڑے کی زیادہ زبردست قوم سے مدد کے طالب ہوں بشرطیکہ
وہ اپنے تئیں انکا مذہبی محافظ ظاہر کرے۔ گزشتہ چند سال کی ہماری سیاسی حماقت نے اس بات کو پہلی مرتبہ ممکن کر دکھایا ہے
اور جو بات کہ گزشتہ نسل میں موہوم نظر آتی تھی وہ اب عملاً خطرہ ثابت ہو رہی ہے +

قدیم عثمانی اتحاد میں خواہ کچھ ہی خرابی کیوں نہ ہو، اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہندوستانی مسلمان اسے بیحد پسند کرتے تھے۔
اور اُسے دنیائے اسلام اور انگلستان کی دوستی کی علامت تصور کرتے تھے اس کی جو بیہودگی کو اسلام کے سب سے بڑے دشمن کی قابل
رشک حیثیت حاصل ہوئی۔ اسی خیال سے جنگ افغانستان کو کم سے کم ابتدائی منازل میں پسند کیا گیا کیونکہ اس سے شمالی طاقت کی شکست
مراد لی گئی تھی۔ اُسے صرف بعد میں بری نظر سے دیکھا گیا۔ لیکن معاہدۂ برلن کے مشکوک انتظامات، جزیرہ قبرص کا بدنام کرنے والا
قبضہ اور ٹیونس کی حوالگی (جب یہ باتیں رفتہ رفتہ معلوم ہوئیں تو انہوں نے) لوگوں کے خیالات میں ہیجان پیدا کر دیا اور انہیں
اس سے زیادہ سخت حوادث کے لئے آمادہ و تیار کر دیا بالخصوص جبکہ انگلستان نے مصر میں کھلم کھلا ظالمانہ روش اختیار کی +

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مسلمانان ہند نے عربی سے دوران جنگ میں ہمدردی کا اظہار کیا۔ انھوں نے سلطان کے اعلان
جسمیں عربی کی بغاوت کا ذکر تھا، غلط مفہوم پیدا کرنے پر اظہار نفرت کیا اور اب گزشتہ دو سال سے یہ حالت ہے کہ روس اُن کا

ویسا دشمن نہیں رہا جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بے اعتمادی پورے طور سے موجود ہے۔ انگریزی وزارت کی وفاداری کے مقابلہ میں انگریزی تاج کی وفاداری ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلی تھی لیکن یہ امر بالکل یقینی ہے کہ جنگ کے بعد سے مصر کی تباہی کی تاریخ اور گورنمنٹ کے بظاہر اس ارادہ نے کہ جوشِ اسلام کے لئے مفید طلب ہوا سے تباہ کر دیا جائے، چاروں طرف انقلاب پیدا کر دیا ہے قسطنطنیہ پر جب سے زوال طاری ہوا ہے دنیائے اسلام ایک حامی کی متجسس رہی ہے اور اگر انگلستان نے اس عہدہ کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو یہ عہدہ کسی دوسری عیسائی طاقت کو دیدیا جائیگا +

میرے خیال میں یہ طریقہ وہ ہے جس کے ذریعہ مسلمانانِ ہند اپنی بہت سی برائیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں علاوہ ازیں ایک اور طریقہ بھی ہے جو میرے خیال میں زیادہ اُمید افزا ہے (اور یہ امر ابھی تک ہماری گورنمنٹ کے اختیار میں ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس کے انتخاب پر مائل کرے) تین سال ہوئے میں نے اپنی کتاب "مستقبل اسلام" میں ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ ہز میجسٹی ملکہ معظمہ سے سلاطین مغلیہ کا شاہی لقب اختیار کر لینے کے بعد سے کیا کیا توقعات رکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر سلطنت مغلیہ کا جانشین ہونے کی حیثیت سے ہز میجسٹی کے فرائض ہندوستانی مسلمانوں سے کیا ہیں۔ اور جب گزشتہ موسم سرما میں میں ہندوستان میں تھا، تو مجھے یہ دیکھکر بہت خوشی تھی کہ میرا بیان بالعموم پسند کیا گیا۔ ہندوستانی مولویوں کی جنمیں شیعہ اور سنی دونوں شامل تھے، یہ رائے تھی کہ ہز میجسٹی نے قیصر ہند کا لقب اختیار کر لینے سے مسلمانوں کی جانب ایک ایسی قانونی ذمہ داری اختیار کر لی ہے کہ جس کی رو سے وفاداری کے عوض میں خاص حفاظت کے مستحق ہو گئے ہیں بالخصوص ایسے معاملات میں جنکا تعلق ان کے مذہبی اوقاف، ان کی تعلیمی ترقی اور انتظامات متعلقہ حج سے ہو اور انہوں نے اردو میں میری کتاب کا ترجمہ بھی شائع کر دیا تھا +

مذہبی اوقاف کے بارے میں میں نے ہر جگہ یہی شکایت سنی کہ ان کا غلط مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس وقت اراضی ملکیت کا مسئلہ درپیش تھا تو اسوقت بہت سی زمینیں اس عذر پر ضبط کر لی گئیں کہ قبالوں کے اندراجات درست حالت میں نہیں تھے۔ بنگال میں محسن ٹرسٹ کے مقدمہ کا اگرچہ کسی حد تک معقول فیصلہ کر دیا گیا ہے تاہم اس کے بیان کرنے کی ضرورت یوں پیش آئی ہے کہ گورنمنٹ نے اس کی نا انصافی کو اب تسلیم کر لیا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس قسم کے بیشمار مقدمات میں نا انصافی برتی گئی ہے۔ اس خاص مقدمہ میں ایک مالدار مسلمان نے بہت سی جائداد صاف طور پر وقف کر دی تھی لیکن گورنمنٹ کئی سال سے اس کی آمدنی کا روپیہ اسلامی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے بجائے ہندوؤں کی تعلیم پر صرف کرتی رہی اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مجھے بار بار یہ اطلاع دی گئی ہے کہ جائداد کا کافی حصہ ابھی تک گورنمنٹ کے قبضہ میں ہے اور یہ کہ اگر اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کی اہم ضروریات اسی کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لیٹز نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ صرف پنجاب میں لاکھوں روپے کے وقف کا سرکاری طور پر غلط استعمال کیا جاتا ہے +

Leitner ۵۱

حج کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ حاجیوں کو لیجانے کے انتظام کو باقاعدہ بنانے اور دوران سفر میں انکی حفاظت کی سخت ضرورت ہے۔ گزشتہ تین سال میں بہت کچھ اصلاح عمل میں آچکی ہے لیکن وہ بہت کم ہے اور ہندوستانی مسلمان اس قسم کی حفاظت کو امپریل گورنمنٹ کا فرض منصبی خیال کرتے ہیں، بالخصوص اس وجہ سے کہ قرنطینہ اور جدہ کے تکلیف دہ قوانین کے باعث برائیاں روز بروز زیادتی پر ہیں ؛

تعلیم کے متعلق مسلمانوں کی پوزیشن حسب ذیل ہے :-

انگلستان کے کیتھولک باشندوں کے مانند انہیں اپنے مذہب سے بیحد شغف ہے اور وہ ہمیشہ اس کے لئے متفکر رہتے ہیں کہ جس برکت کے وہ حصہ دار ہیں وہ اپنی پاکیزہ حالت میں ان کے بچوں تک پہنچ جائے اور انکا خیال یہ ہے کہ جو دنیاوی تعلیم حکومت کی جانب سے دی جاتی ہے وہ ان ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے۔ ہندوستان میں ایک استاد کو اپنے شاگرد سے جو گہرا تعلق ہوتا ہے اس کی مثال کسی دوسرے ملک میں نہیں ملیگی۔ اور مسلمان یہ دیکھ رہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں اساتذہ بالعموم یا تو انگریز ہیں یا ہندو کر مسلمان اسی وجہ سے علٰحدہ رہتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تعلیم کے معاملہ میں وہ ہر قسم کی سرکاری امداد سے محروم ہوگئے ہیں اور جو لوگ مذہب کی سختی سے پابندی کرتے ہیں وہ تمام سرکاری تعلیم سے غیر مستفید رہتے ہیں۔ بلاشبہ ان کے مخالف یہ کہتے ہیں کہ یہ محض تعصب اور خواہ مخواہ کی مخالفت ہے۔ وہ غیر وفاداری کے باعث اس سے متمتع نہیں ہوتے اور یہ کہ وہ ترقی کے خواہشمند نہیں ہیں۔ لیکن پہلے زمانہ میں خواہ کچھ ہی حالت کیوں نہ ہو میں وثوق کے ساتھ کہسکتا ہوں کہ اس بیان میں ذرا سی بھی صداقت نہیں ہے۔ ہندی مولویوں نے جو نقطۂ خیال قائم کیا ہے میرے خیال میں از روئے انصاف اس پر نکتہ چینی نہیں کیجاسکتی اور یہ بات دوسری ہے کہ اس نظریہ کو پیش کیا جائے کہ تمام مذاہب خراب ہیں لہٰذا حکومت کا فرض ہے کہ ان کی تعلیم کو کم کرے میں خیال نہیں کرسکتا کہ حکومت نے اس نظریہ پر اپنے طرز عمل کی بنیاد رکھی ہو مگر عملاً مسلمانوں کی تعلیم پر انکی پالیسی کا بیحد اثر پڑ رہا ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے کہ اگر امپریل گورنمنٹ چاہے تو محافظ کی حیثیت سے دخل دے سکتی ہے۔ مسلمان اس کارروائی سے بیحد خوش ہوجائیں گے اور اسے اپنی وفاداری کے لئے باعث عزت قرار دیں گے ؛

آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امپیریل گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ کو پورے جوش کے ساتھ ہاتھ میں لے اور جہاں کہیں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہو وہاں اس کا خیال رکھے اُن کی تعلیم کی ترقی تجارتی اور صنعتی معاملات میں انکی ہمت ہمت افزائی اور بیرون ہند مقامات میں ان کے مذہبی مفاد کی وفادارانہ حفاظت وہ امور ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے مسلمان رعایا کو انگریزی تاج پر از سر نو اعتماد حاصل ہوجائیگا۔ ان کی جانب سے غفلت برتنا اور اسلام کو نقصان پہنچانے کی موجودہ خراب پالیسی پر عملدرآمد رکھنا انہیں اس حد تک غیر وفادار بنا دیگا کہ پھر وہ وفادار نہ بن سکیں گے۔ اصلاح کا وقت ابھی باقی ہے اور اس نئے اسپر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ بہت جلد وہ زمانہ آجائے جبکہ معاملہ بالکل ہاتھ سے نکل جائے اسلئے کہ مسلمان اپنی تاریخ کے نازک ترین زمانہ میں سے گزر رہے ہیں اور انکی جائز شکایات کی طرف سے بے اعتنائی برتنے میں ہم گویا اُن

شکایات کو بڑھنے کی اجازت دے رہے ہیں جو کسی وقت ہمیں سخت پریشانی میں ڈال دیں گی۔ جو بات میں نے تین سال پیشتر کہی تھی اُسے میں دہرانے کی اجازت چاہتا ہوں یعنی یہ کہ انگلستان کا فرض ہے کہ جس امانت کو اس نے قبول کیا ہے اسے ایشیا کی اچھائیوں کو ترقی دیکر تکمیل تک پہنچائے کہ ان کی تباہی کے درپے ہو جائے وہ اسلام کو تباہ نہیں کر سکتا اور نہ اس سے قطع تعلق کر سکتا ہے لہذا خدا کا نام لیکر اسے اسلام کو ہاتھ سے پکڑ کر نیکی کے راستہ پر ڈالدینا چاہیے" باوجود اس کے کہ مصر میں قوت کو غلبہ حاصل ہو چکا ہے۔ پھر بھی یہی طرز عمل نہایت دانشمندانہ اور قابل تحسین معلوم ہوتا ہے[۱] +

بحیثیت مجموعی انگریزوں کے ماتحت ہندوستان کے ذہنی اور مذہبی پہلو (جیسا کہ میں نے انہیں پایا) نہایت امید افزا ہیں اور مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ ہماری حکومت کے سوائے اور کسی حکومت میں انہیں یہ ترقی میسر نہیں آسکتی تھی +

---

[۱] خوشی کی بات ہے کہ جن امور کی یہاں یہ کہکر سفارش کی گئی ہے کہ وہ انگلستان کے فرائض متعلقہ اسلام میں داخل ہو گئے ہیں، انپر ہمارے حکام نے گزشتہ دو سال سے عملدرآمد شروع کر دیا ہے اور وہ انگریزی پالیسی کا جزو ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ امر قابل افسوس ہے کہ ہندوستان میں اس کے متعلق جو خیال کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ صرف ہندوؤں کی ۱۹۰۹ء کی تحریک سوراج کو دبانے کی غرض سے مسلمانوں کو وفاداری پر ابھارا جا رہا ہے۔

ض۔ ا۔ ب۔ بی اے

ایک روپیہ میں آٹھ سو صفحے

(رسالہ ۱۸×۲۲ کاغذ سفید عمدہ قسم۔ طباعت و کتابت درست۔ امتیاز علم جسکو چاہیں منگائیں مگر فرمائش عدد سے کم نہ ہو۔)

بہرام کی آزادی۔ صـ ۲۰۶	کرشمۂ رقابت صـ ۱۲۰	انجام محبت صـ [illegible]	چھپا ناول صـ ۱۲۸
نانا صاحب کی لوٹ صـ ۱۱۸	شوقین جاسوس صـ ۱۲۰	اندھیر نگری صـ ۳۶	شریف بی بی صـ ۱۰۰
وفادار دلہن صـ ۱۰۰	مالوہ کی بیگم صـ ۵۶	ایرانی خاتون صـ ۴۴	ارشاد و نصیحۂ کامل صـ ۱۰۰
شگوفۂ محبت صـ ۱۰۲	دلہن کی چوری صـ ۵۶	دیوان چیرکیں صـ ۳۶	درد جگر صـ ۶۲
زر پرست صـ ۱۱۲	ہوس انتقام صـ ۱۰۰	ٹرکی حرم سرا صـ ۶۰	مجروم وصال زیب النساء بیگم صـ ۱۳۲
بلائے بد صـ ۱۵۲	وفادار لڑکی صـ ۵۲	جنگ تفقاز صـ ۹۰	منیر و گوہر صـ ۹۴
محب وطن صـ ۹۲	پیارا عاشق صـ ۷۶	میاں بوت صـ ۴۸	وصل جمیل صـ ۴۴
خونی ساحر صـ ۱۲۴	بوالہوس بنگالی صـ ۵۲	لال چھتری صـ ۹۶	اسیر گیسو صـ ۱۲۴
حسین قزاق صـ ۹۶	ممتاز بیگم قتل باولہ صـ ۵۲	انقلاب فرانس صـ ۱۹۶	خون عاشق صـ ۶۰
گنجی کا راز صـ ۱۱۶	بوڑھا دولہا ننھی دلہن صـ ۴۴	سپاہی کی دلہن صـ ۱۴۴	انوکھی جوگن صـ ۴۸
شریف چور صـ ۱۰۸	حسن بنارس یا خفیہ عیاشی کا راز صـ ۶۸	محبوبۂ لندن صـ ۲۲۸	اُٹھتی جوانی صـ ۹۰
گوہر بانو صـ ۴۸	دربار حرام پور صـ ۵۲	خوبی قسمت صـ ۹۲	تمیز دلہن صـ ۴۴
عیار جمیلہ صـ ۴۴	حسین رانی صـ ۵۲	کرشمۂ الفت صـ ۶۰	لاڈلا بیٹا صـ ۴۴
پیرس کا دغاباز صـ ۸۸	بتول باز معشوقہ صـ ۴۴	جلاد بدر صـ ۱۲۶	نئی دلہن صـ ۵۲
ننگ خاندان صـ ۹۶	سگھڑ سہیلی صـ ۳۶	خونی منظر صـ ۹۲	نکیلیہ بیگم صـ ۵۲
مراکش کا خونی ڈاکو صـ ۶۰	ہنسی کا پٹارہ صـ ۵۲	سچی الفت صـ ۶۸	خار غم صـ ۵۲
حسن عیار صـ ۶۰	بچھڑوں کا ملاپ صـ ۵۲	ایران کی شہزادی صـ ۷۶	دیوان جہان صاحب صـ [illegible]

المشتہر مینیجر مفید عام بک ڈپو لکھنؤ (انڈیا)

ڈائری کا ایک ورق

(مسلسل)

آنشب آتشیں روے گرم زند خوانیہاست

گو بشنو اہرمن در شرر فشانیہاست

سنہ ۶ (غالب)

شیریں، اس قسم کی حسین عورتوں میں تھی جن کے چہرہ سے بہ نسبت حسن ظاہر کے حسن فطرت زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور دیکھنے والا بجائے مسحور ہونے کے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ایک عمیق چشمۂ سرمدی تھیں جن میں دلربائی سے زیادہ معصومیت اور مادیت سے زیادہ روحانیت پائی جاتی تھی، اس کی صورت دیکھنے کے بعد ایک شخص ایسا محسوس کرتا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے جب اس سے گفتگو کی جاتی۔ تو وہ اس طرح جواب دیتی جیسے کسی بعید فاصلہ سے کھینچکر اپنے آپ کو واپس لائی ہے اور جواب دیکر پھر وہیں چلا جانا چاہتی ہے۔ ہر چند جب افضال سامنے ہوتا تو اس کا بہترین شغلہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا کہ وہ اس کی صورت کو دیکھا کرے لیکن اس وقت بھی اس کا انداز کچھ کھویا ہوا سا رہتا اور ایک نامعلوم جستجو اس وقت بھی اس کی چتون سے ظاہر ہوتی اس نے جب اپنے ہات کے بنائے ہوے نقوش مجھے دکھائے تو میں نے ان کے اندر بھی یہی رنگ غالب پایا اور کوئی ایک نقش بھی اس کا ایسا نظر نہ آیا جس کو میں "خیال بیدار" کہہ سکتا۔ مناظر سے اُسے خاص دلچسپی تھی لیکن وہ بھی اس قسم کی:۔ ساکن سطح آب، سنسان صحرا، خاموش شب ماہ، برف پوش چوٹیاں۔ ذی حیات چیزوں کی تصویریں بنانے سے اُسے کم دلچسپی تھی اور کبھی ضرورتاً منظر کے ماحول کے لحاظ سے بناتی بھی تو اس میں ایک حزن کی کیفیت پیدا کر دیتی۔

اس کا ایک نقش جس کو فرانس کی اکاڈیمی نے بہت زیادہ سراہا تھا، وہ تھا جو "داستان خموش" کے عنوان سے پیش کیا گیا تھا:۔ صبح کا وقت تھا، طلوع آفتاب سے قبل، رنگ کے لحاظ سے صحیح معنے میں طباشیر سحر، جنگل کی ایک گلاب کی جھاڑی میں شاخ سے ٹوٹ کر گلاب کا مرجھایا ہوا پھول زمین پر پڑا ہے اور بلبل اس کے پاس مر کر سرد ہو گئی ہے، منظر کے ماحول میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کر دی گئی ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ساری کائنات اس حادثہ کے دیکھنے کے لئے جھکی پڑتی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "کہ آپ کا خیال اس نقش کی طرف کیونکر منتقل ہوا؟" افضال بھی موجود تھا، وہ شیریں کو بہت دق کیا کرتا تھا فوراً بول اُٹھا "جس طرح اور بہت سی غیر حقیقی باتوں کی نمائش کے لئے ضرورتاً خیال کو منتقل ہونا پڑتا ہے۔" شیریں جو اس کی اس قسم کی باتوں کی عادی تھی مسکرائی اور بولی کہ "یہ آپ نے بالکل صحیح فرمایا کیونکہ اس نقش میں اگر کوئی جھوٹ حصہ ہو سکتا ہے تو صرف بلبل کا

جان دیدینا - بھول کا مرجھانا تو کوئی عجیب بات نہیں ہے، اور اس حصہ کو خلاف واقعہ دکھانے میں میری مصلحت سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی تھی کہ مدعیان محبت کے فریب پر پردہ ڈالدوں، ورنہ شاید آپ کو تکلیف ہوتی"۔

شیریں بہت ذہین تھی اور میرے نزدیک خطرناک حد تک ذہین، لیکن خیریت یہ تھی کہ اس کا اجمال ایک ایسی معصوم حقیقت تھا کہ وہ اُس کی ذہنیت سے پیدا ہونے والے خطرات کو فوراً بھلا دیتا تھا اور انسان پھر بدستور خواب عشق میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

شیریں اور افضال کی شناسائی سب سے پہلے پیرس میں ہوئی اور وہیں وہ اس درجہ شدید و وسیع ہو گئی کہ وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی دونوں جُدا نہ ہو سکے - شیریں بمبئی میں ایک بڑی جایداد کی تنہا مالک تھی اور سوسائٹی میں نہ صرف اپنی دولت بلکہ اپنی قابلیت و شائستگی کے لحاظ سے بھی خاص عزت رکھتی تھی - افضال یوں تو بظاہر صرف سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتا تھا، لیکن حقیقتاً وہ ایسا مالکانہ اقتدار رکھتا تھا اور اس کا علم تقریباً سبھی کو تھا۔

یقیناً افضال ایک خوش رو انسان تھا اور تمام وہ دلربا ادائیں جو ایک حسن مہذب کو مالوف کرنے کے لئے ایک مرد میں ہونی چاہئے اس میں موجود تھیں، لیکن پھر بھی یہ بات ہر شخص نہیں سمجھ سکتا تھا کہ شیریں نے اسی کا انتخاب کیوں کیا - جب کہ اسی طرح کے بلکہ اس سے زیادہ یہ ظاہری خصوصیات رکھنے والے انسان اور بہت سے اس کو مل سکتے تھے ——— میرے ایک ہفتہ کے مطالعہ نے مجھے بتایا کہ شیریں، افضال سے زیادہ اس کی ذہانت کی دلدادہ تھی اس کے تیکھے پن کی فریفتہ تھی، وہ اس کے جلد برہم ہو جانے کی صلاحیت پر مٹی ہوئی تھی، اور چونکہ وہ خود ایک متامل و خوابیدہ فطرت رکھتی تھی اس لئے وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُسے چونکاتا رہے، جگاتا رہے، اور افضال جو غالباً اس راز کو سمجھ گیا تھا پیدا ہی ہوا تھا چھیڑ اور شرارت کے لئے ———

شیریں کا معمول تھا کہ وہ ایک بات کا جواب دیکر کچھ سوچنے سی لگجاتی اور دیر تک اس کی یہی حالت رہتی، لیکن اس وقت افضال کے استفسار کا جواب دینے کے بعد بھی وہ آمادہ گفتگو تھی اور اس کے ساتھ وہ صناعانہ جذبات جو زیادہ تر دماغ ہی کی فضا میں بند رہتے ہیں، آنکھوں کی چمک سے، لبوں کی ارتعاش سے، چہرہ کی سرخی سے، جسم کی ہلکی بے چینی سے ٹپکے پڑتے تھے

افضال کو جواب دینے کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئی اور بولی کہ ایک نقش دیکھنے کے بعد سب سے زیادہ دلچسپ سوال ایک نقاش کے لئے یہی ہو سکتا ہے کہ اس سے ماخذ نقش، رفتار خیال، انتقال فکر کا سوال کیا جائے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک نقاش کے نقوش، اوراق حیات ہیں، داستان زندگی ہیں - لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خطوط نقش کے ذریعہ سے وہ دوسروں کا فسانہ بیان کرنا چاہتا ہے اور ایسی صورت میں بعض اوقات دیکھنے والوں کو نقاش کی فطرت کے سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے - آپ نے جس نقش کو پسند کیا ہے وہ مجھے پسند نہیں کیونکہ اس میں بلبل کا وجود میرے ذوق کے منافی ہے، مرجھائے ہوئے پھول کے سامنے اس کا مردہ حالت میں پایا جانا گویا نقاش کے اس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ نہ عشق حسن کی مواصلت کی تاب لا سکتا ہے اور نہ حسن پایان عشق سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے - اسی کے ساتھ کائنات کی توجہ گویا اشارہ ہے اس امر کی طرف کے ہر چند یہ حادثے نہایت معمولی ہیں لیکن حقیقت کی لحاظ سے کائنات کو ہلا ڈالنے والے ہیں خیال بھی پامال ہے اور تصویر میں . . . .

اس کا اظہار بھی معمولی بات ہے: میں اگر اکاڈیمی کے بعض ممبروں کے خیال سے آگاہ ہوکر یہ منظر نقش میں پیدا کرنے پر مجبور نہ ہوتی بلکہ آزاد ہوتی، تو میں وہ نقش پیش کرتی جس کو میں نے "انتظار" کا عنوان دیا ہے یہ کہکر ڈاٹھی اور الماری سے ایک تصویر نکال لائی جس کا یہ منظر تھا:-

فضا ابر آلود ہے شام کی تاریکی کافی پھیل چکی ہے اور ایک نوجوان لڑکی اپنے جھونپڑے کے دروازے کھڑی ہوئی ہے ابر کے ٹکڑوں اور بجلی کی چمک کو خوف و دحشت کے ساتھ دیکھ رہی ہے، بجلی کی نورانی لکیروں اور بادلوں کے ٹکڑوں سے ملاکر اس لڑکی کے منتہلے نظر پر ایک نہایت ہی ہلکی سی مٹی ہوئی صورت اس شخص کی پیدا کی گئی ہے جس کے انتظار میں وہ باہر نکل آئی ہے اور اس کے چہرہ سے گویا یہ خیال ٹپک رہا ہے کہ "کیا اب بھی وہ نہ آئیں گے اور نہ آئے تو یہ طوفانی رات کیونکر بسر ہوگی ——

اس تصویر کو دیکھکر میں متحیر رہگیا۔ شیریں نے اس قدر شدید تاثرات ذرا سے صفحۂ کاغذ میں بھر دئے تھے کہ میری آنکھیں نم آلودہ ہوگئیں اور میں اس کی طرف سے نگاہ ہٹاکر بالکل خاموش بیٹھ گیا۔ اس نے میری حالت کو سمجھکر فوراً موضوع گفتگو بدل دیا، اور افضال سے مخاطب ہوکر بولی کہ آپ کو یاد نہیں آج شام کو ماتھران چلنا ہے، مہربانی کرکے سر فضل کریم بھائی کو ٹیلیفون کرکے دریافت کر لیجئے کہ جعفر کمپنی کے مسئلہ میں کل میری حاضری کی تو ضرورت نہ ہوگی"، افضال جو ایسے اوقات میں نہایت ہی مودب سکریٹری کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا، اٹھا اور نہایت ادب سے جھک کر تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوگیا۔

افضال کی یہ خصوصیت کہ موقع ومحل کے لحاظ سے وہ اپنے اوپر متضاد و متباین کیفیات نہایت کامیابی کے ساتھ طاری کر لیا کرتا تھا اس قدر عجیب وغریب تھی کہ میں اس کے اس شعور پر حیران تھا۔ اول دن جب میں نے تنہائی کی ملاقاتوں میں افضال اور شیریں کی گفتگو کو سنا تو حیران رہگیا کہ شیریں، اس کے لئے کس درجہ سراپا ایثار وسپردگی ہے اور وہ اس کے مقابلہ میں کس قدر شریر و گستاخ، لیکن دوسری صبح جب اس نے ڈرائنگ روم میں شیریں کی ڈاک اور کچھ اور کاغذات پیش کئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ملک معظم کے سامنے کوئی اسکا سکریٹری مودب کھڑا ہوا احکام حاصل کر رہا ہے

میں نے ایک دن افضال سے اس کے متعلق گفتگو کی تو اُس نے کہا کہ آپ نہیں جانتے آج کل کی مہذب و تعلیم یافتہ عورت کس قدر پیچیدہ معمہ ہے۔ علی الخصوص اُس وقت جب دل کا معاملہ اس کے سپرد کیا جائے کہ پھر اس صورت میں تو اسکی نگہداشت ایک ناگن سے زیادہ کرنی پڑتی ہے، شیریں پر جو اقتدار مجھے حاصل ہے، نتیجہ ہے میری چار سال کی کوشش کا اور بڑی حد تک مجھے اسپر اعتماد ہونا چاہئے لیکن باور کیجئے جس وقت میں اس عورت کو بات بات کرتے دفعتہً کسی غور وفکر میں مبتلا ہو جاتے دیکھتا ہوں تو میرا دل دھڑکنے لگتا ہے اور ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب جو نگاہ مجھ پر اٹھے وہ شیریں کی افضال پر نہ ہو بلکہ ایک مالکہ کی خادم پر ہو۔ یہی سبب ہے کہ میں اس کے اس جذبۂ تعوق کی جو قدرتاً اس کے دل میں ہونا چاہئے، تسکین کرتا رہتا ہوں اور گویا اس طرح اس کو بتا دیتا ہوں کہ عورت خواہ کتنی

ہی بڑی مدعی ایثار و قربانی کی کیوں نہ ہو، لیکن میں اسپر اعتبار نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ سنکر غالباً حیرت ہوگی کہ اس نے اتنے طویل عرصہ میں انتہائی لطف و مسرت کی گھڑیوں میں بھی کبھی میرے اس طرز عمل پر کوئی تنقید نہیں کی اور ایک بار بھی اُس نے یہ نہیں کہا کہ اس رسم کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک عورت ہر وقت عورت ہی نہیں رہتی بلکہ وہ کبھی انسان بھی ہو جاتی ہے۔ اور انسان بھی وہ جو صرف جذبات کے لئے، جذبات ہی کے ذریعہ سے زندہ رہنا چاہتا ہے اور کوئی فلسفۂ حیات اس کے سامنے نہیں ہوتا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ شیریں کے سمجھنے کے لئے میں نے اپنی انفرادیت کو کس قدر ناقابل فہم بنا دیا ہے، اس میں بار بار غور و تامل ہمیشہ میری فطرت کا معمہ سمجھنے کے لئے پیدا ہوتا ہے اور جب اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوتی، تو اس میں ایک مفتوحانہ انفعال پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب میرے اندر صحیح معنے میں استغناء کامل پیدا ہوتا ہے

آپ باور کیجئے کہ میری نگاہ سے اس قدر ذہین عورت نہیں گزری، خطرات قلب پر آگاہ ہو جانا اس کی ذہانت کا ادنیٰ کرشمہ ہے، لیکن خود ستائی نہ سمجھئے یہ بھی واقعہ ہے کہ مجھ سا انسان بھی اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شیریں کا وہ زمانہ جب یہ پیرس میں تھی اس کی فتوحات کا عجیب و غریب زمانہ تھا، بڑے سے بڑا انسان جو اس کے دائرۂ تعارف میں آجاتا تھا اس طرح بے بس ہو کر رہجاتا تھا جیسے جالے میں پتنگا اور پھر اس کی بے اعتنائیوں، بے دردیوں کا وہ عالم ہوتا تھا کہ خدا کی پناہ وہاں کے تمام بلند طبقوں کے لوگ اس کو "قلوپطرۂ ہند" کے لقب سے یاد کرتے تھے، آپ کا وقت تو ضائع ہوگا لیکن میری اس کی اولین ملاقات کی داستان سننے کے قابل ہے: ہاں عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ شیریں کو دیکھ لینا محبت کر لینا ہے اور محبت کر لینا تباہ و برباد ہو جانا!" یہ تھا اس کے حسن و دلربائی کا عالم اور اسی کے ساتھ اس کی خودداری اور تمکنت کا رکھ رکھاؤ۔

میں موسیو ژوردان کا جو پیرس کا مسلم الثبوت ماہر علم الکیمیا ہے، مہمان تھا، میری اس کی ملاقات کیونکر ہوئی۔ یہ ایک اور داستان ہے، پھر کبھی سناؤنگا، بہر حال میں ژوردان کے ہاں مقیم تھا اور ایک امیر کے ہاں جو ژوردان کا قدیم دوست تھا، میں بھی ایک جلسۂ رقص میں مدعو تھا۔ پیرس کی تمام بہترین سوسائٹیوں کا گویا عطر کھنچکر اس جلسہ میں آگیا تھا۔ شیریں بھی وہاں تھی اور اس شان کیساتھ کہ پیرس کی بڑی بڑی خوش وضع اور تیکھی عورتیں اسپر رشک کر رہی تھیں۔ جب اول اول صاحب خانہ نے میرا تعارف اس سے کرایا اور اس نے ہاتھ ملایا تو انگلیوں کے مس ہوتے ہی اس نے اپنا سب سے پہلا مشہور حربہ مجھپر صرف کیا، اس کی نرم و نازک انگلیاں میری ہتیلی سے اس طرح آہستہ آہستہ گزر رہی تھیں گویا وہ کوئی پیام سنا رہی ہیں اور اس کی نگاہیں اس قدر متین، رحم طلب اور روادارانہ انداز سے میری نگاہوں سے مل رہی تھیں جیسے انھوں نے کوئی اپنی دیرینہ آرزو پالی ہے۔ میں نے اس کو محسوس کیا اور تھوڑی دیر تک یہ حالت رہی جیسے سیلاب میں کسی کے قدم اُکھڑ جائیں، لیکن چونکہ میں پہلے ہی اُس کی ان مار رکھنے والی اداؤں کا ذکر سُن چکا تھا اور یوں بھی کافی تجربہ اس طرح کی دلربائیوں کا رکھتا تھا، اس لئے جب تک وہ اس سحر کاری میں مصروف رہی میں اپنی حالت سے اُسکو یہی یقین دلاتا رہا کہ اس کا حربہ خالی نہیں گیا، لیکن جب اس یقین کے بعد اُس نے اپنے پندار میں مجھے نیم بسمل کر کے ہاتھ سے ہاتھ اور نگاہ سے نگاہ جدا کر کے منہ موڑا ہی تھا کہ میں ہنس پڑا، یعنی یہ میرا پہلا حربہ تھا جو میں نے ان کے خلاف استعمال کیا۔ یہ اُسکی

زندگی کا پہلا تجربہ تھا اس لئے جب اُس نے منہ پھیر کر میری طرف دیکھا، تو میں نہایت ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا اور بولا کہ معاف فرمائے کبھی دل کا تاثر بھی ہنسی پر مجبور کر دیتا ہے خاصکر جب بیشتر بلکے قسم کا ہو اس لئے الزام مجھ پر نہیں ہے" وہ کچھ دیر تک دیکھتی رہی گویا اسے اب بھی یقین نہ تھا کہ میں ہنسا تھا، میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ کیا آپ مجھے اجازت دے سکتی ہیں کہ میں آپ کو رقص گاہ تک پہونچا دوں" اُس نے تھوڑا سا تامل کر کے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور میں اس کو سہارا دیتا ہوا بڑھا۔ وہ خاموش تھی لیکن متفکر صورت سے، میں بھی خاموش تھا لیکن عیارانہ انداز سے۔

رخصت ہوتے وقت اس نے مجھے پھر دیکھا لیکن ان نگاہوں سے جو بیک وقت نشہ بخش بھی تھیں اور جرأت آموز بھی، میں نے سے دیکھا لیکن ان نگاہوں سے جو یکسر کیفیات سے خالی تھیں ——— اس کے بعد جلسہ کے دوران میں باوجود اس کی جستجو کے بھی میں اس سے نہ ملا اور جب اس کو کسی طرف سے آتے ہوئے دیکھا تو قصداً ہٹ گیا، اور اس انداز سے کہ وہ میرے احتراز کو سمجھ لے۔

دوسرے دن وہ خود موسیو تردوان کے مکان پر آئی میں اس سے ملا لیکن ایک سرد خودداری کے انداز سے اور پھر ایک خاص ضرورت کا بہانہ کر کے چلا گیا۔ اس نے میری نسبت موسیو تردوان سے بہت گفتگو کی اور جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہ جا ، پر بلائی گئی ہے اور دوسرے دن دعوتی رقعہ بھی میرے نام کا آ گیا۔ تردوان کو چونکہ اُس وقت بہت مصروف تھا اس لئے وہ نہ جا سکا اور تنہا مجھی کو جانا پڑا۔ شیریں کی دولت و امارت کا حال مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا لیکن اس کی جائے قیام پر جا کر مجھے اس کی پاکیزگی ذوق اور وسعت مطالعہ کا حال بھی معلوم ہوا۔ اس صحبت میں جو گفتگو اُس سے ہوئی اس کی تفصیل تو یاد نہیں مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ جب میں اُس سے رخصت ہوا ہوں تو اور زیادہ اس کے لئے معمہ بن گیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ جستجو و خلش تھی۔

اس کے بعد زمانہ گزرتا گیا، مراسم بڑھتے رہے، تکلف دور ہوا، مختلف وقت و محل کی گفتگو نے مجھے اُن کے اور ان کو میرے ذوق کے سمجھنے میں مدد دی لیکن جس حد تک رابطۂ جنسی کا تعلق ہے وہ میرے لئے چیستاں تھیں اور میں انکے لئے عقدۂ مشکل۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں میرے لئے اور ان میں میرے لئے خاص مرکزیت پیدا ہونے لگی اور ان کی دلچسپیاں محدود ہو کر رفتہ رفتہ صرف میری ذات سے متعلق ہو گئیں، لیکن حالت یہ تھی کہ ہم دونوں گویا دو شعلے تھے جو علحدہ علحدہ جل رہے تھے، اور باوجود شدید تمایل کے ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے تھے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ پہلی ملاقات کے دو ماہ بعد ہی میری خدمات ایک سکرٹری کی حیثیت سے انھوں نے حاصل کر لی تھیں اور اب میں شب و روز انھیں کے ساتھ رہتا تھا۔

آپ یہ سنکر حیرت کریں گے کہ کامل چار سال اسی عالم میں گزر گئے ہیں اور میں اپنی اس رہبانیت میں خاص قسم کی لذت محسوس کرنے لگا ہوں، ادھر انکا یہ عالم ہوا کہ شوخیاں متانت میں، لہو و لعب سنجیدگی میں اور فرحت کے تمام اوقات نہایت عمیق غور و فکر میں بسر ہونے لگے۔ آپ ان کے اولین نقوش اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بعد کے نقوش سے وہ کس قدر متباین ہیں۔ آپ کو جو خط میں نے لکھا تھا ہر چند وہ بالکل حقیقت کے خلاف تھا، لیکن میری تمنا کے بالکل موافق تھا۔ پہلے دن جب آپ آئے

اس وقت بھی میں نے آپ کو دھوکا دینا چاہا، لیکن اب چونکہ آپ سے اس مسئلہ میں صحیح مشورہ کرنا تھا اس لئے ضرورتاً یہ سب بیان کرنا پڑا۔ دنیا جو چاہے سمجھے لیکن اس کو میں ہی جانتا ہوں کہ یہ برسوں کی الفت کس طرح اب تک ناشگفتہ حالت میں پڑی ہے۔ اگر اسوقت تک کی میری ان کی صحبتوں اور خلوتوں کی گفتگو کو تحریر میں لے آیا جائے تو بہترین عاشقانہ لٹریچر فراہم ہو سکتا ہے، لیکن حقیقت و معنی کے لحاظ سے، شاید ہی کوئی دفتر اس سے زیادہ مہمل و لایعنی نظر آئے۔

شادی کا سوال براہ راست تو نہیں ضمنی طور پر بارہا پیدا ہوا لیکن آخر کار میں اور وہ دونوں اسی نتیجہ پر پہونچے کہ شادی نام ہے صرف باہمی غلط فہمی اور ایک سخت لذت شکن نتیجہ کا اس لئے اب کوئی صورت سوا اس کے نہیں ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں یا پھر وہ کروں جو شادی سے بہتر لیکن انسانیت سے بہت فروتر ہے ——

نیاز

(باقی)

بادۂ ناب - مجموعہ رباعیات فارسی میر ولی اللہ صاحب بی اے عمر

مطالبۂ فطرت - مجلد اتحاد فلسفہ اسلام پر ایک بیمثل تصنیف عمر

عروس ادب - حضرت ہوش بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ عہ

سالومی - اسکر وائلڈ کا نہایت مشہور ڈراما ترجمہ مجنوں گورکھپوری ۱۲ر

تذکرہ بلھے شاہ - پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات مستند ذرائع سے قیمت صرف عہ

بندگی - امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا بیمثل ترجمہ حقائق دینی و تصوف کی بینظیر کتاب قیمت ۱۰ر

کاس الکرام - عمر خیام کے مفصل حالات زندگی او مکمل شرح اس موضوع پر پہلی کتاب ہے قیمت صرف تین روپے

خلق عظیم - یعنی اخلاقی مضامین پر احادیث نبوی کا ایک مکمل مجموعہ مجلد عہ

فتنہ خلق قرآن - امام عبدالعزیز بن یحییٰ کی کتاب "الجیدۃ" کا ترجمہ مسئلہ قرآن کے متعلق ایک بینظیر محاکمہ قیمت صرف ۱۰ر

لسان الغیب - حافظ شیرازیؒ کی سوانح عمری اور ان کے دیوان کی بہترین شرح جلد اول تین روپے جلد دوم عا

یادگار غالب - مرتبہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی قیمت صرف تین روپے۔

کلیات نظم حالی - شمس العلما حالی کے تمام منظوم کلام قیمت ۱۲ر

نقش ارژنگ - جلال الدین صاحب کی غزلوں کا مجموعہ عہ

شہاب کی سرگزشت - مولانا نیاز کا بیمثل فسانہ عہ

تاریخ دولتین - جرجی زیدان کے تاریخ تمدن اسلامی کا ترجمہ قیمت صرف عہ

صحابیات - عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات عہ

جذبات بھاشا - از مولانا نیاز - ہندی شاعری کے بیمثل نمونے ۱۲ر

شاعر کا انجام - حضرت نیاز کا اولین بے مثل فسانہ ۱۲ر

انتخاب اودھ پنچ - سنہ ۱۸۷۶ء کے اودھ پنچ کی جلدوں کا انتخاب عہ

منیجر نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

چہ می گوئیاں

(میری تصویر کے متعلق)

کوہاٹ (صوبہ سرحد)
محررہ ۱۸ر مارچ سنہ ۱۹۲۸ء

(۱)

نیاز صاحب!

السلام علیکم - یقیناً ان چند اصحاب میں سے ایک میں بھی ہوں جنھوں نے آپ کی تصویر کو "اپنی ذہنی تصویر" سے مختلف پایا ہو گا - اس لئے میرا خیال ہے کہ پہلے میں اپنی ذہنی تصویر کے متعلق کچھ لکھکر آپ کے سامنے پیش کردوں - اور پھر آپ کی اصلی تصویر کے متعلق چند جملوں میں اظہار خیال کردوں -

میرا خیال تھا کہ نیاز ایک دبلا - پتلا ضعیف الاعضار - نحیف الجثہ چند ہڈیوں اور پوست کا مجموعہ ہوگا (گوشت نہیں) سر کے بال منڈے ہوئے یا لمبی لمبی لٹیں ہونگی اور داڑھی شریف حضرت سر سید علیہ الرحمۃ سے کسی صورت کم نہ ہوگی اور دنیا کے تمام داڑھی منڈوں کا کفارہ ہوگی - آنکھوں پر پرانے زمانے کی عینک ہوگی، سفید فریم کہیں سے خمیدہ کہیں سے شکستہ ہوگا - گردن اقتا[دہ] اور کمر خمیدہ ہوگی - اُٹھتے ہوں گے تو ہاتھ میں چھڑی عصائے موسیٰ کا کام دیتی ہوگی - ارد گرد کتابوں کا انبار ہوگا - جنہیں مطالعہ کرتے کرتے گردن جھکے رہنے کی عادی ہوگئی ہوگی - سرکشی تو کہیں نام کو نہ ہوگی - لباس نہایت سادہ پرانی طرز کا لیکن صاف ستھرا زیب بدن ہوگا اور روزانہ مشغلہ یہ ہوگا - کہ ایک حضرت آکر پوچھتے ہوں گے "فراعنۂ مصر کے متعلق آپکا کیا خیال ہے - کتنا عرصہ ہوا - وہ تہ زمیں ہوئے ہیں" دوسرے صاحب کہتے ہوں گے "مرزا غلام احمد قادیانی نے جو نبوت کا دعویٰ کیا ہے وہ سچا ہے یا جھوٹا اگر جھوٹا ہے تو اس کے پیرو کیوں روز بروز بڑھ رہے ہیں" تیسرے صاحب اگر دریافت کرتے ہوں گے "کیوں نیاز صاحب آپ کون سے مذہب کے پیرو ہیں "باب استفسارات" سے تو نمایاں ہوتا ہے کہ آپ نیچری یا دہری ہیں" غرض جتنے منہ اتنی باتیں -

مگر فروری کے نگار میں جب پڑھا کہ آئندہ اشاعت میں آپکی تصویر بھی زیب رسالہ ہوگی تو دل کی عجیب حالت تھی خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا - نہیں معلوم ایک دہری - ایک نیچری - ایک گم کردہ راہ (بہ الفاظ چند کوتاہ اندیش حضرات یا آپ کے خیال کے مطابق اور نگ زیب جیسے مذہبی متعصبین کے الفاظ میں) اس ظالم نے سیکڑوں گوشت پوست کے پردوں میں رہکر کیوں اتنی محبت گانٹھ لی - خیر انتظار کی گھڑیاں جوں توں کرکے گزریں ۱۳ر ماہ رواں کو آپ کا رسالہ پہونچا - بد قسمتی سے میں مکان پر نہ تھا اور میرے ایک فاضل دوست نے رسالہ کھول کر پڑھنا شروع کردیا - جونہی میں پہونچا "کیا نگار آگیا" یہ وہ جملہ تھا جس نے مجھ سے علیک سلیک سب کچھ چھڑا دیا بولے "ہاں آتو گیا - لیکن

نیاز کی یہ تصویر نہیں - اور اس نے معذرت کی ہے کہ اگلے مہینے تصویر شائع ہوگی" (اس فاضل دوست نے تو بطور تفنن یہ کہا تھا) گر میری زبان نے نہیں بلکہ شوق بے پایاں نے چند بے نقط ایسی سنائیں کہ اگر آپ ہوتے تو نہ معلوم اینجا نب آج کس گوشۂ عافیت میں آرام فرما ہوتے - میں نے کہا کہ یہ (آپ) اسی طرح کرتا ہے - اگر تصویر نہ چھپوانی تھی تو وعدہ کرنے کی کونسی ضرورت تھی - میرے دوست کچھ دیر تک تو میری خرافات نہایت سنجیدگی سے سنتے رہے اور جب میں خاموش ہوگیا تو انھوں نے نہایت متانت سے رسالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا " بڑھاو، نہ آپس میں الفت زیادہ" بھائی جان ایک شریف آدمی کو اس کی غیبت میں اس قدر کوسنا اچھا نہیں یہ تو تصویر ہے اب میں کیا لکھوں - کہ میری دل کی کیا حالت تھی - فرطِ محبت سے قریب تھا کہ میں کچھ اور سنا جاتا لیکن خیر گزری آپ کو اپنی ذہنی تصویر سے تمامتر مخالف پایا - لیکن شکر للہ حضرت اکبر مرحوم والا معاملہ نہ ہوا - یعنی آپ اس قدر "زشت رو" نہ ہوئے کہ "طبع جمیل دارد" کہنے سے دل گریز کرتا - ماشاء اللہ ہم سے کسی صورت کم نہ نکلے - اچھے خاصے توانا و تندرست - داڑھی کا صفایا - مونچھیں مصطفےٰ کمال سے ٹکر کھاتی ہوئی - آنکھیں کمانیدار عینک کے پردوں میں سے جھانک جھانک کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں اور آپ ہیں کہ کرسی پر اس قدر اکڑ ے بیٹھے ہیں کہ گویا کبھی یہ گردن جھکی ہی نہیں - یہ تو ہے صرف نصف تصویر (Bust) کی حالت اور اگر ساری ہوتی - تو خدا معلوم

خیر نیاز فتحپوری ــ ۱۳/۲ ــ نے ایک خاص شان پیدا کرلی - لیکن افسوس آپ نے جہاں اپنی تصویر سے ملاقات کراتے ہوئے چند جملے تحریر کئے وہاں ایک یہ جملہ بھی اپنی مصروفیت ماضی وحال کے متعلق لکھنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائی (اپنی سوانحعمری) اور یہ حسرت ہمارے دل رہ گئی - خدا کرے کہ آپ یہ تکلیف بھی گوارا فرما کر ہم کو شادگردانیں - والسلام

مخلص آوارۂ و مجنونے رسوا سر بازارے

یعنی خیر محمد از کوہاٹ

---

(۲)

گورنمنٹ نارمل سکول

کیمبل پور

۲۰ ــ ۳/۲۸

نیاز و مولانا نیاز

مارچ کا نگار کیا تھا - میرے دنیائے دل کے لئے پیغام حشر تھا - میں نے رسالے بھی دیکھے ہیں اور ان کے اڈیٹر بھی لیکن مجھے اتنی حیرت کبھی نہیں ہوئی، جتنی کہ مولانا ابوالکلام کی تصویر اور جناب نیاز کی تصویر کے مطالعہ سے ہوئی - میں نے ابوالکلام کا حشر زیر الہلال دیکھا اور پڑھا میں نے نگارستان کے مضامین بھی پڑھے ہے - اور باب الاستفسار کو ہمیشہ میں نے نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا،

نگارستان پڑھ کر مجھے مصنف کے رند مشرب ہونے کا علم ہوا، اور باب الاستفسار کے مطالعہ سے ان کی فضیلت علمی اور جامعیت کا --- تاہم میرے نہاں خانۂ دماغ میں آپ کی جو شبیہ تھی وہ بالکل اُس سے مختلف تھی جو ماہِ مارچ کا نگار پیش کرنے والا تھا۔ چنانچہ جب نیاز کی تصویر کے روبرو ہوا تو کوئی ۵ منٹ تک مجھ پر سکتہ کی سی حالت طاری رہی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تصویر کو دیکھتا رہا اور شوقِ دید تھا کہ اُمنڈا چلا آتا تھا۔ اور دیکھنے سے طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ اب بھی یہی حالت ہے۔ جب چاہتا ہوں پرچۂ نگار اُٹھا کر جناب نیاز کے فوٹو سے آنکھیں سیراب کرتا ہوں۔

اپنے استعجاب کی وضاحت کے لئے اگر میں اپنی ذہنی شبیہ کا خاکہ اتار دوں، تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔

میرے دماغ میں جناب نیاز کی تصویر یہ تھی کہ وہ ایک سلجھے ہوئے مولانا ہیں۔ پاسِ وضع کے لئے مختصر سی ریش مبارک بھی ہے۔ رنگ ذرا سیاہی مائل، اور دُبلے پتلے عینک کا شوق کبھی کبھی فرماتے ہیں۔ مگر فیشن کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے کہ آنکھیں دیکھنے سے جواب دے چکی ہیں۔ پُرانی وضع کے آدمی ہیں مگر عام طور پر جدید وضع کے لوگوں سے ملنا پسند کرتے ہیں۔

بخدا کس کافر کو گمان ہی تھا۔ کہ اس کافر نیاز کی تصویر اس بلا کی چھچھال اور دل فریب ہوگی، تصویر دیکھ کر بے اختیار جی نے چاہا کہ لپٹ جاؤں اور اس روشن پیشانی کے بوسے لوں، اب جب آنکھیں بند کر کے نیاز کی رند مشربی، جامعیت اور فضیلت علمی کا اس تصویر سے سامنا کرتا ہوں، تو دل مانتا ہی نہیں کہ یہ تمام اوصاف اِس نیاز کے ہیں۔ میں تو اب بھی جب نیاز کے کمال علمی اور تبحر پر غور کرتا ہوں تو یہ کم بخت ضدی دماغ وہی شبیہ پیش کرتا ہے جس کا ذکر کر چکا ہوں اور میں ہر چند اسی نیاز کو دماغ میں جگہ دینا چاہتا ہوں۔ لیکن وہاں سے جواب آتا ہے کہ تمہارا نیاز وہی ہے۔ اس نئے نیاز سے بے نیاز ہی رہو۔

یہ تصویر اس نیاز کی نہیں جس نے قدیم طرزِ تعلیم کے مطابق تعلیم پائی ہے۔ جو رند مشرب ہونے کے باوجود سید کے دل و دماغ اور آزاد و شبلی کے زورِ قلم کا مالک ہے۔ اور تم یقین کرو۔ کہ تمہارے مولانا نیاز نے تمہیں حیران کرنے کے لئے کسی جج یا بیرسٹر کی تصویر شائع کر دی ہے، اس کے یہ معنے نہیں کہ ایک جرنلسٹ کو ایسی صورت عطا نہیں کیجا سکتی نہیں بلکہ ایک ہندوستانی جرنلسٹ کو کم از کم اس نعمت سے ضرور محروم رکھا جانا چاہئے۔

میں جب اس نئے نیاز کی اس شبیہ کو دیکھتا ہوں تو انکی جگرِ دار آنکھیں میرے دل کے پار ہوئی جاتی ہیں اور میں کانپتا ہوں کہ خدایا، اگر اس شخص سے کہیں میں دوچار ہو گیا۔ تو میں نے بھی جو اپنی ادب دانی اور علمیت کا تھوڑا بہت رعب مولانا نیاز پر بٹھا رکھا ہے وہ اس نیاز کے سامنے تو ہوا ہی ہو جائیگا۔

ایک معمہ اب تک لاینحل ہے۔ کہ مضبوط اور جسیم آدمی عام طور پر بطی الذہن ہوتے ہیں۔ (اور یا یہ "حُسنِ ظن" ہے جو مجھے اس جماعت کے متعلق اس لئے پیدا ہو گیا ہے۔ کہ میں خود جسیم نہیں ہوں) پھر یہ نیاز جس سے اب میرا تعارف ہوا ہے میرے مولانا نیاز کی طرح ذکی الفطرت کیوں ہے؟

اور پھر جس نیاز کی تصویر میرے سامنے ہے وہ نیاز تو قیامت کا بلا نوش معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ میرے مولانا نیاز کی شبیہ

تو متانت اور سنجیدگی کی مجسم تصویر ہے۔ اس لئے نہیں کہ متانت اس زمانے میں کوئی قابل قدر صنعت ہے۔ بلکہ اس لئے کہ فاضل وعالم مولانا نیاز کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔

آخر میں اپنے دل کو یوں تسلی دیتا ہوں کہ ڈائری، چنگاری، اور نگارستان کا نیاز تو یہی ہے جس کی تصویر نگار میں شایع ہوئی ہے۔ اور باب الاستفسار کا نیاز وہ ہے جس کی تصویر میرے نہانخانۂ دماغ میں محفوظ ہے

عزیز

(نگار) داغ کا نہایت مشہور اور پر لطف شعر ہے:۔

شریر آنکھ نہ بیقرار، چتون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے

میرے کوہاٹی اور کیمبل پوری عزیزوں نے میرے، اور میری تصویر کے متعلق جو کچھ اظہار خیال کیا ہے، اس کو اگر ایجاز کے ساتھ شاعرانہ زبان میں ادا کیا جائے تو داغ کا مذکورۂ بالا شعر پڑھ دینا کافی ہے

نہایت معمولی مسئلہ ہے کہ تجربات انسانی کے بعض نتائج تصویر و قیاس کی رہبری کرتے ہیں ہمیشہ کامیاب ثابت نہیں ہوتے........ علی الخصوص اسوقت جب ہم اپنی نفسیات ذاتی پر اعتماد کرکے فراستیات (Physiognomy) کے متعلق کوئی حکم لگانا چاہیں۔ اس لئے میرا معمول ہے کہ جب کسی نادیدہ شخص کی صورت کے متعلق محض اس کے آثار و افکار کو دیکھکر کوئی رائے قائم کرنا چاہتا ہوں تو ہمیشہ عام شاہراہ سے ہٹ کر کیونکہ دنیا میں کم ہیں ایسے نفوس جو جسم و روح کے لحاظ سے متوازن و متطابق نظر آئیں۔

میں ریاض کا نام عرصہ سے سن رہا تھا لیکن دیکھا نہ تھا۔ جب میں نے اول مرتبہ بھوپال میں اُن کو دیکھا تو مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ میرے کیا کسی کے بھی تصور میں یہ بات نہیں آسکتی کہ جو شخص ایسے شعر کہہ سکتا ہے:۔

گلا میٹھا ہوا خدمت اذاں کی اور کعبہ میں
بھلے سے ہم دبا لائے تھے ناقوس برہمن کو

یا۔

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اُٹھالے

وہ صورت کے لحاظ سے اس قدر مقطع ہوگا کہ دیکھکر خواہ مخواہ بیعت کے لئے ہاتھ بڑھ جائے۔ لاکھ شیب و انحطاط سہی، مجبوری و پیری سہی، لیکن ایسی بھی کیا "منافق پیشگی" کہ وہی شخص جو کسی وقت کعبہ میں ناقوس بھونکنے اور کسی کو گود میں چپکے سے اُٹھا کر لے جانے کے لئے طیار تھا آج ایسا نظر آتا ہے کہ گویا یہ حضرت ہمیشہ سے تو "تیمم" ہی تھے۔ وہ شخص جو جوانی کی بادہ

بادہ خواری کو پیری تک نباہ دینے میرے نزدیک زیادہ قابلِ قدر ہے اُس انسان سے جو کچھ دنوں تک منکرِ خدا فلسفی رہے اور پھر مذہب کے باب میں اس قدر غلو سے کام لے کہ ہر بے عقلیؔ داخلِ ایمان کرے۔ سمجھ کر خدا سے انکار کرنا بے سمجھی کے اقرار سے بہتر ہے کیونکہ گر اس نے کبھی خدا کو خدا مان لیا تو ادہر اروں سے منوا چھوڑے گا، اور اس کا اقرار خود اس کے لئے بھی ...... مفید نہیں خیر، بہر حال مدعا یہ ہے کہ خیال انسانی ایک شخص کی صورت گری میں غلطی کر سکتا ہے، جس طرح خود ایک شخص کی وضع دوسروں کو مبتلائے فریب کر سکتی ہے، لیکن میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ آپ کو یا کسی اور کو کب میری اس قدر توہین کرنے کا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے بھی اسی جماعت میں شامل کرے جس کے ہاں صحت اخلاق کی علامت صرف صورت کو بگاڑ لینا ہے اور فضل و کمال کی دلیل اپنے اوپر صرف کہنگی و بوسیدگی طاری کر لینا یہ غریب اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اخلاقیات کس قدر جمالیات کے پابند ہیں اور جب تک یہ ذوق مکمل نہ ہو اس کا دعویٰ یکسر مکر و فریب ہے۔ میرا حال تو ہمیشہ یہی رہا کہ "شگفتہ روئی گلہائے بوستانم سوخت" اور میں نے ہمیشہ رندی کے حسن کو زہد کی زشت روئی پر ترجیح دی ہے اب آپ کو اختیار ہے خواہ بیعت کیلئے اسی دلِ خانہ خراب کا انتخاب کیجئے جس کے عذر سے بھی صد ہزار ساماں نیاز پیدا ہیں یا کسی ایسی جھکنے والی پیشانی کا جس کا ایک ایک سجدہ "پرورش لات وہبل" ہے۔

میرے کوہاٹی دوست کی یہ خواہش بھی تھی کہ تصویر کے ساتھ میں اپنے حالات زندگی بھی لکھتا، اپنے اکتسابات ذہنی سے بھی آگاہ کرتا اور وہ سب کچھ لکھتا جو آج کل ایک "غرور نما عجز" کے ساتھ ہر شخص لکھا کرتا ہے، لیکن میں اس سے احتراز کروں گا کیونکہ جھوٹ بولنے کی مجھے عادت نہیں، اور سچ لکھوں تو سب سے پہلے اپنے جہل و بے مائگی کا اعتراف کروں جسے شاید میرا نفس گوارا نہ کرے۔

اپنی فطرت کے متعلق البتہ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ جس در تک پہونچنے کے لئے میں سراپا اضطراب ہوتا ہوں وہاں بھی حتی الامکان اس وضع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا کہ۔

هم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا ئو

بھوپال کے دوران قیام میں اپنے بعض احباب کے شدید اصرار پر ایک نظم میں نے موجودہ فرمانروائے بھوپال کے حضور میں پیش کی تاکہ ایک وعدہ کی یاد دہانی کروں، باوجود اس کے کہ غرض میری تھی، اور اعلحضرت کی ذات حقیقتاً یوں بھی ایسی ہے کہ جو مدح و ستائش کیجائے زیبا ہے، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں لکھ چکا تو معلوم ہوا کہ اس میں تو ممدوح سے زیادہ میں خود اپنی تعریف کر گیا ہوں مفت تو ضائع ہوگا، چند شعر سُن لیجئے :-

زمن سپاس تو آید ہمیں کہ نالانم　　زخندہ ات چہ نوا بردہ ام کہ گریانم
نگاہ مہر کہ بر من فگندہ اینم　　سحاب لطف کہ بر من فشردہ دامانم
دلے ز آرزوئے خود ہنوز منفعلم　　ز اقتضائے کمال خودش پشیمانم

بدست من سپر دامنِ خود رسید دہ
وگرنہ چاک شدن خواہدش گریبانم

عجب نباشد اگرمی زنی بدستارت
بجائے طرّہ، کہ من گوہرے زعمّانم

بہ بر مرا بہ مشاہت کہ شکم از تاتار
بکش مرا بہ برت تیغ از صفاہانم

مرا بہ افسر و دیہیم خود بدہ جائے
کہ من بہ تاب و صفا لعلے از بدخشانم

مرا بپرس ز حسّان و شیخ شیرازی
کہ نغمۂ عرب و طوطئے ز ایرانم

مرا بہ وعدۂ لطفے چہ شاد نمودی
نہ زیبدت کہ تماشا کنی پریشانم

جہاں کنی کہ تو امروز نیشتر سازی
ہمان امید کہ دی ساختی رگ جانم

تاملے کن و قدرم شناس و کام دہ
کہ باشد از نظر عدل و نظم شایانم

وگرنہ دہ خبر از نامرادیم کہ زنم
بہ سنگِ سختِ فنا قلب نالہ سامانم

اور اگر آپ اس سے زیادہ میری حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو پھر عرفی کی زبان میں اُسے بھی سُن لیجئے :-

من کیستم آن سالک کونین مسیرم
کز بیختۂ جوہر قدس ست خمیرم

در صفحۂ تصویر حلال ست مثالم
در پردۂ تقدیر محال ست نظیرم

چون حسن کشد جام صفا رنگ شرابم
چون عشق دہد رنگ جبینی بہ زریرم

در قامت عاشق شکن آموز کمانم
در غمزۂ معشوق کشایش دہ تیرم

بر کتف ریاضت طلبان شال و پلاسم
بر دوش زلیخا منشان بردِ حریرم

در کوزۂ لذت شکنان چشمۂ زہرم
در کاسۂ کودک منشان جرعۂ شیرم

انجا کہ ادب نغمہ طراز است سمیعم
وانجا کہ ہنر جلوہ فروش ست بصیرم

عشقم کہ بر آسودہ دلان نیست گزارم
حسنم کہ ز خونین جگران نیست گریزم

در خانۂ مجنوں کہ خراب ست غبارم
در حجلۂ لیلےٰ کہ بہشت ست عبیرم

میگویم و اندیشہ نہ دارم ز ظریفاں
من زہرہ را مشگر و من بدر منیرم

سر بر زدہ ام با مہ کنعاں زیکے جیب
معشوق تماشا طلب و آئینہ گیرم

آن چشمۂ قربم کہ ز لب تشنگی وحی
جبریل در آید بجر مگاہ ضمیرم

نیاز

لکھنؤ کا ایک غیر لکھنوی شاعر

(آسی الدنی)

نظمیات میں جس قدر دلچسپی مجھے غزل سے ہے اسی قدر نفرت بزم مشاعرہ سے ہے، کیونکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ غزل کہی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے اور مشاعرہ نام ہے یکسر تکلف و تصنع کا جہاں ہر ممکن آورد کے ساتھ ایک مخصوص زمین میں طبع آزمائی کیجاتی ہے اور یہ "بہ ستم می رسد" کا تغزل کم از کم میرے جذبات کو تو اپیل کرتا نہیں۔ عرب کے قدیم بازار عکاظ کا ذکر نہ کیجیے، کہ یہاں نہ وہ فضا پیدا ہوسکتی ہے اور نہ طبائع میں وہ حقیقی جوش، وہاں کا شاعر وہی کہتا تھا جو بے اختیارانہ اس کی زبان سے نکل جاتا تھا اور یہاں کا وہ عالم ہے کہ ریاض نے عمر بھر شراب کا ذکر کیا، لیکن غریب کو بقدر لذت کام و دہن بھی چکھنے کی توفیق نہیں ہوئی بلکہ اس سے زیادہ انحطاط ذوق یہ دیکھئے کہ حافظ کو اگر بادہ خوار کہہ دیا جائے جس نے واقعی شراب پینے کے بعد ہی شراب کا ذکر کیا ہے تو ایک بڑی جماعت جنگ کے لئے طیار ہو جاتی ہے اور سمجھتی ہے کہ دنیا کا عظیم ترین کفر اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہی، کیونکہ ان کے نزدیک اسلام نام ہے صرف اس اعتقاد کا کہ "حافظ میگسار نہ تھا"۔

مشاعرہ میں اگر کبھی گیا بھی تو یہ دیکھکر کہ "منافقوں کا اتنا بڑا ہجوم میرے سامنے ہے" گھبرا گیا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہزار میں ایک شاعر بھی ایسا نہیں، جو حقیقی معنے میں کیفیات محبت اپنے اوپر طاری کرنیکے بعد کوئی شعر پیدا کرتا ہو۔ اور زبان سے وہ کہنا جو دل میں نہ ہو اپنا وقت ضائع کرنا ہے اور دوسروں کو فریب میں مبتلا کرنا۔

یہ مسئلہ بجائے خود یقیناً تحقیق طلب ہے کہ اس زمانہ کا شاعر، عاشق کیوں نہیں ہوتا۔ آیا حسن کی پیداوار بند ہو گئی ہے یا دل کی تعمیر کا اسلوب بدل گیا ہے۔ بہر حال جو سبب بھی ہو یہ ایک واقعہ ہے اور اسی چیز کے فقدان نے رفتہ رفتہ رنگ تغزل کو نہ صرف بے نمک اور بے اثر بلکہ اس کے معیار کو اس درجہ پست کر دیا کہ خدا کی شان ہے آج متشاعرین لکھنؤ بھی اپنے آپ کو شاعر سمجھنے لگے جن کی پرواز خیال، کلام کو پر اثر بنانے کے لئے اس سے زیادہ بلند نہیں جاتی کہ کبھی اپنا جنازہ نکالدیا، کبھی نزع میں ہچکیاں لینے لگے، اور بہت ترقی کی تو صیاد و آشیاں، بلبل و باغباں کی فرسودہ و پامال داستان ظلم و تظلم کی تکرار کرکے اپنے حال سے اسکو منطبق کرکے دکھا دیا بہر حال یہ ہے ساری کائنات اس دور کے شعراء کی (الاماشاء اللہ) جنپر "طنطنۂ مشاعرہ" اور یہ ہنگامۂ تغزل وسعازلہ قائم کیا جاتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ ان انجمنوں کا نام رکھا جاتا ہے ایسا جس سے معلوم ہو کہ "ادب کی اعانت" اور ادب کا عروج انہیں کی وجود سے قائم ہے۔

ارباب نظر سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ گزشتہ دس سال کے اندر لکھنؤ سے باہر کی دنیا میں رنگ تغزل نے ایک خاص تبدیلی اختیار کی ہے اور وہ یہ کہ غزل میں زیادہ سنجیدہ، زیادہ وزنی اور زیادہ تخئیلی مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔ ہر چند میں ایسے

کلام کو صحیح معنی میں غزل کے نام سے تو موسوم نہیں کر سکتا، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ نظم ہونے کے لحاظ سے وہ یقیناً قابل قدر ہے۔
اور زیادہ روشن مستقبل کی خبر دیتا ہے۔ یہ تغیر ذوق عام میں کیوں ہوا، اس کے خارجی اور ماحولی اسباب جو کچھ بھی ہوں، لیکن اس کا ایک اندرونی اور ذاتی سبب یہ بھی ہے کہ جب تکلیف محبت ضعیف اور غزل کا صحیح عاشقانہ رنگ مفقود ہونے لگا (اور ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ہر دور کی عمر اور ہر شاعر کا ایک دور ہوا کرتا ہے) تو لوگوں نے اس کمی کو محسوس کر کے اس کی تلافی کرنی چاہی اور تصوف و فلسفہ کی مدد سے کلام کو پر کیف بنانے کی سعی کی، ہر چند اس ہنگامہ میں یہ بھی ہوا کہ بعض شاعر لغو سے لغوتر ہوگئے لیکن اسکا عام اثر یہی ہوا کہ ذوق بلند ہونے لگا اور نگاہ زیادہ دقیق و نکتہ رس۔ مگر غالباً یہ سنکر حیرت ہوگی کہ اہل لکھنؤ نے جن کو زباندانی کے غرور بیجا نے کبھی ذوق سلیم کی سطح تک اُبھرنے نہ دیا اب بھی بدبختی سے اس تغیر کو قبول نہ کیا جس نتیجہ کا پورا احساس اسی وقت ہو سکتا ہے جب کوئی شخص یہاں کے محافل شعر و ادب میں جاکر شرکت کرے اور دیکھے کہ سب سے زیادہ داد کس شعر کو ملتی ہے۔

عربی زبان میں شاعروں کے کئی درجے مقرر کئے گئے ہیں۔ پہلا وہ شاعر جید ہے جو اپنے اشعار سے لوگوں کے امیال و عواطف میں تبدیلی پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے اس کو وہ خنذیذ کہتے ہیں، اس کے بعد مرتبہ شاعر کا ہے جو قدرت کی طرف سے شاعر نہ دماغ لیکر آیا ہے اور کسی نہ کسی وقت اس کا خنذیذ ہو جانا مستبعد نہیں ہے، تیسرا درجہ شویعر کا ہے جو شاعر کی تصغیر ہے یعنی معمولی قسم کا شاعر، چوتھا درجہ شعرور کا ہے جس سے بہت ہی ضعیف قسم کا شاعر مراد ہوتا ہے۔ آخری درجہ کے شاعر کا نام متشاعر ہے، یعنی وہ جو شاعر تو پیدا نہیں ہوا لیکن سعی و تکلف سے وہ اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرنا چاہتا ہے، پھر اگر آپ کو شعرور، شویعر شاعر و خنذیذ کی تلاش کی ہوس ہے تو جہاں جی میں آئے جا کر جستجو کیجئے خدا کی زمین وسیع ہے، لیکن اگر آپ کو صرف متشاعر درکار ہے تو لکھنؤ سے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، بھانت بھانت کا متشاعر آپ کو یہیں ملجائیگا اور اس قدر افراط سے کہ مجھے اپنے دفتری اور چپراسی کی طرف سے بھی یہ شبہ پیدا ہونے لگا ہے کہ کہیں ان میں تو یہ جراثیم موجود نہیں یہ تھی میری رائے لکھنؤ آنے سے قبل بھی یہاں کے شعراء کے متعلق اور مستقل قیام کے بعد تو اس کی تصدیق ایمان کی حد تک ہوگئی ہے۔

میں بہت دیر آشنا اور خلوت پسند انسان ہوں اور اس لئے میرے متعلق ہر شخص اول اول یہی رائے قائم کر لیتا ہے کہ میں بہت مغرور و متکبر ہوں، حالانکہ غرور و تکبر کے لئے میرے اندر اس سے زیادہ اہلیت نہیں ہے، جتنی خدا میں عجز و انکسار کے لئے، لیکن چونکہ لوگوں کے اس خیال کو محو کرنے کی ہی ضرورت محسوس نہیں کرتا اس لئے خاموش رہتا ہوں یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بعض حضرات کو اپنے خیال کی غلطی تسلیم کرنا پڑتی ہے اور بعض اخیر تک اسی کفر میں مبتلا رہتے ہیں خیر، بہر حال جب میں یہاں آیا تو عرصہ تک اس سے بیخبر رہا کہ یہاں کون شاعر کس رنگ کا ہے۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب جناب وصل بلگرامی کا وجود (جو موت کی طرح میری شہرگ سے زیادہ قریب رہتے ہیں) یہاں کی انجمن معین الادب میں استن حنانہ کی حیثیت رکھتا تھا اور انکا مکان شعراء لکھنؤ کی کثرت آمد و رفت سے بالکل تختۂ بازار بنا ہوا تھا۔ پھر ان میں سے بعض کا نغمۂ داؤدی بھی کانوں تک پہونچا جن کو اپنی خوش گلوئی پر ناز تھا، بعض کا وہ لب و لہجہ بھی سنا جس کے متعلق میں یہی سمجھ سکا کہ شاید یہاں کے بعض فقیر اسی طرح صدا لگاتے

ہوں گے، اسی طرح بعض کا رونا، بعض کا سسکیاں بھرنا بھی میری نیند میں حارج ہوتا رہا لیکن یہ جرأت کبھی نہیں ہوئی کہ اس جماعت میں شریک ہوکر زیادہ قریب سے اپنے سامعہ اور باصرہ کو مجروح ہونے دوں۔

الغرض ایک زمانہ گزر گیا، یہاں تک کہ اس ہجوم کی "غلاظت" میں رفتہ رفتہ کمی آئی اور کبھی کبھی مجھے بھی چند منٹ "وصل کدہ" میں صرف کرنے کی ہمت ہوئی۔ کبھی کبھی کی ان مختصر صحبتوں میں شعر خوانیاں بھی ہوئیں اور میں نے ان سے لطف بھی اٹھایا، لیکن کسی صاحب سے بے تکلف ہونے کا اقدام میں نے نہیں کیا۔ یہاں کے آنے جانے والوں میں ایک شاعر جناب آسی بھی تھے جو اب میرے بے تکلف دوست ہیں۔ میں نے اُنکو بارہا دیکھا اور سوائے اس کے کہ میں نے انہیں ہمیشہ نیک طینت انسان سمجھا اور کوئی خاص دلچسپی ان کی اداؤں سے نہیں لی۔ چونکہ میں شعر سننے کی فرمائش بہت کم کرتا ہوں اس لئے باوجود اس کے کہ وہ میرے پاس تشریف لاکر بیٹھ جاتے تھے میں بہت کم ان کے کلام سے مستفید ہو سکا کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے وہ خود بھی اپنا کلام سنانے کے زیادہ شائق نہیں ہیں۔ چند دن بعد مجھے کوئی رسالہ نظر آیا، جس میں جناب آسی کا یہ شعر درج تھا:۔

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے   بہت مجبور ہوکر ہم نے آئین وفا بدلا

لکھنؤ آنے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ میرے جمود میں جنبش پیدا ہوئی اور دیر تک میں اس شعر سے لطف اٹھاتا رہا۔ جناب آسی میرے پاس آئے تو میں نے اس شعر کی داد دی اور ان سے فرمائش کی کہ مجھے اپنا کلام مطالعہ کے لئے دیں چنانچہ انھوں نے اپنا مجموعہ جو اب تک غیر مطبوعہ ہے مرحمت فرمایا اور یہ مضمون اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔

ہرچند حضرت آسی ضلع میرٹھ کے ایک قصبہ آلدن کے رہنے والے ہیں، لیکن تقریباً گزشتہ ایک قرن سے وہ یہیں زندگی بسر کر رہے ہیں اور لکھنؤ کی فضا سے اس قدر مانوس ہیں کہ اگر میں انہیں لکھنوی کہدوں تو شاید وہ بُرا نہ مانیں گے، ہرچند شاعری کی حیثیت سے انھیں لکھنؤ سے اتنا ہی بُعد ہے جتنا مجھے تصوف سے ہے۔

جناب آسی بہت کہنہ مشق شاعر ہیں کیونکہ کم و بیش بیس سال سے وہ اس فن کے دلدادہ ہیں اور انکی عمر چونکہ ابھی چالیس تک بھی نہیں پہونچی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری نے بھی ان کے شباب کے ساتھ ہی ساتھ طلوع کیا لیکن فرق یہ ہے کہ شباب اب رخصت ہو گیا (جسکا غالباً جناب آسی کو اعتراف نہ ہوگا) اور شاعری بدستور قائم ہے اور شاید پوری جوانی کے عالم میں یوں تو ہر شخص کے خیالات و جذبات ماحول سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن وہ شخص جو فطرت کی طرف سے شاعرانہ دماغ لیکر آیا ہے اور پھر شاعری بھی کرنے لگتا ہے، اس کا مجموعۂ کلام حقیقتاً اس کی زندگی کی تاریخ ہوا کرتا ہے اور اس سے ایک شخص بآسانی سُراغ لگا سکتا ہے۔ کہ اس کے جذبات نے زندگی میں کیا کیا راہیں اختیار کیں۔ اس نظر سے جب ہم کلام آسی کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعرانہ زندگی کے لحاظ سے اُن پر مختلف دور گزر چکے ہیں اور اب یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وہ حقیقتاً کیا کہنے کے لئے پیدا ہوئے تھے اور حالات زندگی یا ماحول نے اُن کو کب اور کس قدر اس راہ سے ہٹایا۔ ان کے ہاں قدماء دہلی کا بھی رنگ پایا جاتا ہے، اور متاخرین کا بھی اسیطرح لکھنؤ کے قدیم رنگ میں بھی اُنھوں نے لکھا ہے اور جدید رنگ میں بھی۔ پھر چونکہ ان تمام رنگوں کے لئے کسی کا دماغ موزوں

نہیں ہو سکتا اس لئے ظاہر ہے کہ ان میں کوئی ایک رنگ وہبیات کے تحت میں ہوگا اور باقی سب اکتسابات و تکلفات کے سلسلہ میں۔ میں اس وقت جبکہ مجھے کافی موقعہ بالاستیعاب ان کے کلام کے مطالعہ کا نہیں ملا، یقین کے ساتھ ان کے فطری ذوق کو تو متعین نہیں کر سکتا لیکن ان کے موجودہ رنگ کو دیکھ کر بہ گمان غالب یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ نیم عاشقانہ اور نیم فلسفیانہ انداز بیان کے شائق ہیں لیکن بالکل ممکن ہے کہ کسی وقت جب عہد شباب کے افسانے اُن کی یاد سے بالکل محو ہو جائیں یا یوں کہئے کہ وہ اپنی جوانی کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائیں تو وہ نیم عاشقانہ رنگ بھی زائل ہو جائے اور صرف وہی تجربات رہجائیں جو ایک عاشق دیرینہ سال دل کی ساری آگ بجھ جانے کے بعد بطور نظریوں یا مسلمات کے اپنے چھوٹوں کے سامنے بیان کیا کرتا ہے۔ اس کا اندیشہ مجھے اس لئے ہے کہ وہ اب بھی اپنے آپ کو ایسا ہی جانتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

اَب کون ہے رموز محبت کا راز داں
اک ہم رہے ہیں، ہمکو کوئی پوچھتا نہیں

اسی زمین میں، اس سے زیادہ خشک ناصحانہ لب و لہجہ ملاحظہ ہو

یہ سب فریب ہے نظر امتیاز کا
دنیا میں ورنہ کوئی بھی اچھا برا نہیں

بہر حال یہ تیور اچھے نہیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ جب ہم اسی زمین میں یہ شعر دیکھتے ہیں

یا سب خموش ہیں مری حالت کو دیکھ کر
یا اب جہاں میں کوئی بھی میرے سوا نہیں

تو پھر اُمید وابستہ ہو جاتی ہے اور خیال پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے طبیعت مستقلاً یہ رنگ اختیار کرے۔ انہی کا بالکل ابتدائی رنگ شاعری کوئی خاص بات ایسی نہیں رکھتا جس سے ان کے مستقبل کی شاعری کے متعلق کوئی اچھی راے قائم کی جاسکتی۔ مثلاً :۔

دو جہاں سے کھو دیا عشق بت بے پیر نے مفت میں کافر نے ناحق کی رسوائی ہوئی

بالکل جُدا نہ ہو جئے کچھ واسطہ سہی ہاں ہاں وفا نہیں ہے تو اچھا جفا سہی

زخم کھا کر مجھے اس پہ نمک کی خواہش بے نمک کھانا کوئی چیز زرا مشکل ہے

ہائے اب تو خیال گیسو میں نیند بھی رات بھر نہیں آتی

یہ ابتدائی قسم کے اشعار سنہ ۰۶ء و سنہ ۰۷ء کے ہیں۔ اس کے بعد تین چار سال کے اندر ذوق میں اتنی تبدیلی پیدا ہوائی کہ قسم بالا کے اشعار کے ساتھ ساتھ حسب ذیل رنگ بھی کہیں کہیں نظر آنے لگا:۔

شرمندہ ہو رہے ہیں تری بیرخی سے ہم — منہ ہی نہیں جو بات کریں اب کسی سے ہم
اتنا تو سمجھے خیر تری دشمنی سے ہم — آئندہ دوستی نہ کرینگے کسی سے ہم

وہ اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں جوانی میں — مصیبتیں جو سنی تھی کبھی کہانی میں

آپ نے پوچھ لیا خیر اب اچھا ہوں میں — ورنہ مرجانے کی امید پہ جیتا ہوں میں

سنہ ۱۲ء تک کوئی خاص تبدیلی آسی کے کلام میں پیدا نہیں ہوئی، اور معلوم ہوتا ہے کہ جس فضا میں انکی غزلگوئی کی ابتدا ہوئی تھی، اس کا اثر بدستور قائم رہا اور کوئی خاص بلند سوسائٹی ذوق شعری کے لحاظ سے ان کو ایسی نصیب نہیں ہوئی جو انکو صحیح راستہ پر لگاتی۔ لیکن غور کرنے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ برابر کرتے رہتے تھے اور غالباً یہی ایک ذریعہ انھوں نے ذوق شعرگوئی کی اصلاح کے لئے تجویز کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نگاہ میں وسعت، خیال میں بسط، اور انداز بیاں میں کچھ حلاوت پیدا ہونے لگی لیکن عدم مشق یا توازن شناسی کے احساس کی کمی پھر بھی باقی رہی۔ چنانچہ سنہ ۱۸ء کے بعد کی غزلیں جو لکھنؤ کے دوران قیام میں کہی گئی ہیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اسی زمانہ کی ایک غزل کا مطلع ہے:۔

برق جانسوز غم یار کو ارماں نہ رہا — نہ سہی خیر جو اک سوختہ ساماں نہ رہا

دوسرا مصرعہ بہت صاف ہے، لیکن پہلا مصرعہ بالکل آورد ہے اور نامناسب حد تک۔ اسی زمین کا ایک شعر اور ہے:۔

اُس نگاہ غلط انداز کے اللہ رے فریب — میں نے سمجھا کہ مجھے اب کوئی ارماں نہ رہا

شعر بہت اچھا ہے اور صحیح رنگ تغزل رکھتا ہے لیکن اتنی خامی باقی ہے کہ دوسرے مصرعہ میں میں اور مجھے کا اجتماع ہو گیا جو ہر چند ناجائز نہیں لیکن ذوق سلیم کے لئے بار ہے۔ ایک اور غزل کا مطلع ہے:۔

فریاد ہے اے خدائے بالا — درد جگری نے مار ڈالا

اس میں کلام نہیں کہ شعر خاص اثر کے ماتحت کہا گیا ہے لیکن خدائے بالا اور درد جگری کی ترکیب بالکل ادھورا ہے۔

اسی زمین کے دو شعر یہ ہیں:۔

دل کش سہی نالۂ سحر خیز — لیکن نہیں کوئی سننے والا
شب ہے سوتی ہے ساری دنیا — روتا ہے غریب رونے والا

جن میں میر کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک غزل کا مطلع ہے۔

ہائے ساماں کوئی حسبِ مقدر نہ ملا		دل ملا ہمکو مگر درد کا خوگر نہ ملا

اس کا بھی دوسرا مصرعہ نہایت پاکیزہ ہے لیکن چونکہ مطلع بنانے کی فکر تھی اس لئے حسبِ مقدر نے شعر کا مطلب غارت کر دیا۔ اسی زمین کا ایک شعر ہے اور خوب ہے:-

تجھ سے اُمید ہے سب کچھ مگر اے جذبۂ دل		مر ہی جاؤنگا اگر وہ مجھے در پر نہ ملا

اسی زمین کے اور شعر ہیں:-

اثرِ آہ ضروری سہی لیکن اے دل		میں نے ڈھونڈا جسے اکثر وہی اکثر نہ ملا

قصۂ جوشِ جنوں شبِ فرقت کو نہ چھیڑ		خیریت تھی کہ مجھے رات ترا در نہ ملا

شعروں کے اچھے ہونے میں کلام نہیں، لیکن پہلے میں لفظ ضروری نے نقص پیدا کر دیا، اور دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں توالی اضافات بہت ثقیل ہے، اسی طرح دوسرے مصرعہ میں خیریت تھی کا استعمال صحیح نہیں کیا گیا، اس کے بجائے خیر گزری کہنا چاہئے تھا۔ اس گفتگو سے میرا مقصد یہ ہے کہ آسی اس شاعری کے لئے پیدا نہ ہوئے تھے جس کی انھوں نے ابتدا کی تھی اور اسی لئے باوجودیکہ کوئی ایسا موقعہ ان کو ہات نہ آیا تھا کہ ان کے ذوق کو صحیح راستہ پر لگا دیتا انھوں نے محض مطالعہ کی مدد سے اور اپنی فطری رہنمائی کی بنا پر آہستہ آہستہ وہ راہ تلاش کرنی چاہی جس کے لئے ان کے اندر ایک مخفی جستجو پائی جاتی تھی، لیکن چونکہ اس نوع کی رہبری تمام نقائص کو دفعۃً دور نہیں کر سکتی اس لئے باوجود ترقی خیال اور جذبات نگاری کے، اسلوب بیان، تلاشِ الفاظ اور انتخاب تراکیب میں خامیاں باقی رہیں۔

میں صحت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آسی کا یہ دورِ شاعری کب ختم ہوا، میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ آسی کا موجودہ رنگ (جس کو دیکھکر اس لئے بہت زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ لکھنؤ کی فضا میں پیدا ہونے کے باوجود اس قدر غیر لکھنوی ہے) گزشتہ دور سے بہت مختلف ہے اور اب نسبتاً ان کی غزلوں میں زیادہ پرکیف اور عمیق شعر نکلتے ہیں۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان کا موجودہ رنگ شاعری نیم عاشقانہ و نیم فلسفیانہ ہے، لیکن کہیں کہیں وہ صرف عاشقانہ بھی ہو جاتا ہے اور کہیں محض فلسفیانہ، لیکن ان میں سے کوئی تقسیم بھی ایسی نہیں ہے جو داد طلب نہ ہو۔ زندگی ایک کارگاہ تمنا ہے سیلابِ آرزو ہے، اور باوجود اس کے کہ اکثر تمنائیں ناکام رہتی ہیں انسان اس کے فریبِ تکرار سے نہیں گھبراتا، اس فلسفہ کو ہلکے سے عاشقانہ رنگ کے ساتھ آسی نے کس خوبی کے ساتھ ظاہر کیا ہے:-

پھر بڑھ چلا تلاطمِ طوفانِ آرزو		حالانکہ ڈوب کر ابھی ابھرا نہیں ہوں میں

تمناؤں کی مسلسل ناکامی آخرکار انسان کو مایوس کر دیتی ہے اور اس مایوسی میں جو تاویلیں کی جاتی ہیں ان میں سے ایک بہترین تاویل کو آسی نے اس طرح ظاہر کیا ہے:-

اے بدگماں شدائدِ دنیا پہ صبر کر   نطرت کو تیرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں

ایک غزل کے یہ دو شعر تقریباً ایک ہی جذبات کے ماتحت لکھے گئے ہیں:-

شبِ غم ہوش آتا ہے تو اکثر سوچتا ہوں میں   کسے آوازدی تھی میں نے سرگرم فغاں ہو کر

مٹا جاتا ہوں تیرے ساتھ اے بانگِ جرس میں بھی   جئے کب تک کوئی محوِ تلاشِ کارواں ہو کر

مگر فرق یہ ہے کہ پہلے شعر میں عالمِ حیرت و جستجو ہے، اور دوسرے میں شاعر ایک نتیجہ پر پہونچکر مآلِ کار کو پیش کرتا ہے۔ آسی کی ابتدائی یا وسطی دور سے ان اشعار کا مقابلہ کیجئے تو یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ دونوں کلام ایک ہی شاعر کے ہیں۔ آسی کا محبوب موضوع گفتگو بے ثباتی عالم اور اس کے متعلقات کا اظہار ہے اس کو وہ مختلف صورتوں سے، متنوع طرزِ ادا کے ساتھ بیان کرتے ہیں:-

نمائش گاہ عالم فردِ کلی بے ثباتی میں   کوئی یہ بھی نہیں سمجھا نہاں کیا تھا عیاں کیا تھا

مرا دورِ گزشتہ بھی یونہی گزرا ہے اے ہمدم   بنا رکھی تھی اک صورت خوشی کی شادماں کیا تھا

شعراء گلشن کی تباہی کا باعث بلبل کے نشیمن کو قرار دیتے ہیں۔ آسی نے اس پامال خیال کو کس قدر جدت کے ساتھ ظاہر کیا ہے:-

خار و خس جمع کرے نام نشیمن رکھدے   جس کو منظور ہو گلشن کا بیاباں کرنا

اس میں ایک طرف تعمیرِ نشیمن کی بے حقیقتی اور دوسری طرف اثر کے لحاظ سے اس کے نتائج کی اہمیت کو جس حسن کیساتھ دکھایا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

ذیل میں ان کے مختلف غزلوں کے منتخب شعر جن سے ان کے صحیح رنگ کا علم ہو سکے درج کئے جاتے ہیں:-

خیر آساں ہی صبر مگر اے ناصح   کبھی دیکھی تھی یہ حالت مری غمخانے کی

اس طرف سے دوڑتی جاتی ہے میری زندگی   اس طرف سے موت خود لینے کو آتی ہے مجھے

بات اصل میں یہ ہے کہ میں کچھ کر نہیں سکتا   کہنے کے لئے یہ ہے کہ تقدیر بُری ہے

بڑھتا رہا ہمیشہ خیالِ محالِ عیش   آخر مرے دماغ کو بیکار کر دیا

اُس چشمِ فسونگر کی اُف ری ستم آرائی   ہونا ہی پڑا دل کو آمادۂ رسوائی

بیکار بُرا مانا تم نے مرے شکووں سے   دیوانہ تو دیوانہ سودائی تو سودائی

اپنے نالوں سے تمنائے اثر بھی ہے مجھے   اور مزا یہ ہے کہ قسمت کی خبر بھی ہے مجھے

صاف کہتے ہوئے ڈرتا ہوں حکایت اپنی   خوفِ مایوسئ اربابِ نظر بھی ہے مجھے

مجھ کو دنیا کی محبت نہیں چھٹتی آسی   ورنہ ہونے کو تو اللہ کا ڈر بھی ہے مجھے

بہت کچھ عقل نے پہلو مری تقدیر کا بدلا   مگر اب تک نہیں بدلا نہ قانونِ خدا بدلا

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

زمانہ شکوۂ نیرنگ پر مجھ سے یہ کہتا ہے
کہ تو خود ہی بدلتا جا رہا ہے میں نے کیا بدلا

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں دنیا مرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلا

تمام احباب عاجز آ گئے تھے مجھکو سمجھا کر
مگر ناکامیوں نے میری میرا مدعا بدلا

پھول ہنس ہنس کر دکھاتے ہیں جہاں کو داغِ دل
ہمنوا فریاد کے بھی سیکڑوں انداز ہیں

تفصیل معنیِ غمِ الفت طویل ہے
اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

اصطلاحاتِ محبت ہیں زمانہ سے جدا
صبر بگڑا ہوا اک نام ہے ناچاری کا

اُمیدِ عفو خوب ہے لیکن نہ اس قدر
کچھ نیکیوں سے مجھ کو سروکار ہی نہیں

عشق حسرت آفریں ہے حسن جرأت سوز ہے
موت سے بھی کچھ زیادہ زندگی دشوار ہے

آلامِ زندگی کی حقیقت نہ پوچھئے
لاکھوں تو ایسے ہیں جو مجھے یاد بھی نہیں

دیکھا ہے ہم نے آسیؔ مضطر کو بارہا
ناشاد اگر نہیں ہے تو کچھ شاد بھی نہیں

پیشتر تاکیدِ ضبطِ گریہ تھی میرے لئے
اب مضر بتلائی جاتی ہے ہنسی میرے لئے

رنگِ نشاط دیکھ مگر مطمئن نہ ہو
شاید کہ یہ بھی ہو کوئی صورت ملال کی

موسم بہار کا ہے ہنسو اے گلو ہنسو
جب تک خبر نہ ہو تمہیں اپنے مآل کی

احساس اب نہیں ہے مگر اتنا یاد ہے
شکلیں جدا جدا تھیں عروج و زوال کی

نہ سنئے مری زندگی کی کہانی
بسر کر رہا ہوں بسر ہو رہی ہے

سبب دل تنگیِ غنچہ کا اتنا جانتا ہوں میں
کہ غم دنیا کے بے تعداد ہیں اور زندگی کم ہے

میری سعی اور میری کوشش ہی کیا
بہت کچھ کروں گا تو مر جاؤں گا

شکوۂ جور و دل آزاری کو چھوڑ
یا پھر اس رنگِ وفاداری کو چھوڑ

جی خوشی سے موت کا ارمان کیا
چھوڑ اب اس رسمِ بازاری کو چھوڑ

کھل گیا دنیا پہ ربطِ حسن و عشق
وہ ہنسے مجھ کو پسینا آ گیا

جب سے میں دنیا کی نظروں سے گرا
خود مری نظروں سے دنیا گر گئی

مرے احباب سب تیار ہیں ہمدرد بننے کو
مگر مشکل ہے آسیؔ مجھ سے ترکِ مدعا ہونا

میٹھا میٹھا درد دل میں رہ گیا
ہنسنے والے ہنسنے کے چلتے ہو گئے

صبر پر دل کو تو آمادہ کیا ہے لیکن
ہوش اڑ جاتے ہیں اب بھی تری آواز کے ساتھ

بے جان تمنا کہہ رہا ہے آج تو اے دل
اسے کہنا پڑے گا دشمن جاں تمنا بھی

جنون عشق میں وہ محویت رہی طاری
کہ خود مجھے کبھی اندازۂ و زمانہ ہوا

سمجھتا ہوں کہ دنیا میں ہمیشہ رنج سہنا ہے
مگر پھر کیا کروں آسی اسی دنیا میں رہنا ہے

اُمید جانفزا ہے اگر تو ہوا کرے
ہم وہ نہیں کہ جسے زمانہ وفا کرے

کرونگا زیست کا ساماں بھی بمجبوری
ابھی تو موت کا اور انتظار کرتا ہوں

یا سب خموش ہیں مری حالت کو دیکھ کر
یا اب جہاں میں کوئی بھی میرے سوا نہیں

اور آگے بڑھ فدا اے ہمت مردانہ آج
ہے کوئی پردہ میں یا آواز ہی آواز ہے

سوچ اے غافل کہ تو قابل زمانے کے نہیں
یا زمانے کی ہوا تیرے لئے ناساز ہے

وہ عشق جو تاثیر سے محروم نہیں ہے
ہوگا کہیں لیکن مجھے معلوم نہیں ہے

میں چپ بیٹھا ہوا ہوں اور یہ معلوم ہوتا ہے
کہ جیسے اک زمانہ کہہ رہا ہے داستاں میری

وہ راز وسعت آبادئے عالم کو کیا جانیں
جو بیٹھے ہی نہیں جا کر کسی خاموش منظر میں

تعیں حد صبر کروں کس امید پر
تکلیف ایک حالیہ ٹھہری ہوئی نہیں

برسوں حریم ناز نے دھوکے دئے مجھے
اب دیکھتا جو ہوں تو یہاں کوئی بھی نہیں

خانہ بربادیِ بلبل اک مصیبت ہے مگر
برق کی تکلیف کا بھی کوئی حاصل چاہیے

بدنصیبی میری سعی ناخدا کے ساتھ ہے
آ کے ساحل پر سفینہ ڈوب جانا چاہیے

میں نہیں ہوں حشر کے دن محرم افشائے قتل
میں تو کہتا تھا تمہیں دامن بچانا چاہیے

مجھے تو یاد نہیں ہے کوئی خوشی ایسی
شریک جس میں کسی طرح کا ملال نہ تھا

اس سال فصل گل میں اجڑا تھا بنتے بنتے
رہتا تو آشیاں کو اب ایک سال ہوتا

اُسی محفل سے میں روتا ہوا آیا ہوں اے آسی
اشاروں میں جہاں لاکھوں مقدر بدلے جاتے ہیں

سمجھ لینا کہ اے شوق رہائی جان دیدونگا
جو پھر طعنے دئے مجھکو مری بیدست پائی نے

مصلحت بینی مرے جوش جنوں کی دیکھئے
میں کھڑا ہوں آپ اپنا راستا روکے ہوئے

آج تکلیف ہوئی درد جگر سے آسی
اُسنے پوچھا تو کچھ اُسنے مجھے کہنے نہ دیا

اب تو یہ چاہتا ہوں کہ اے تمہارے غم
آئے کبھی ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

عرصۂ حشر میں تھی بھیڑ بہت کچھ لیکن
مجھکو پہچان کے چھوڑا مری رسوائی نے

کیا ہو گیا ہے ہم کو آسی کہ ہنسے اون سے جس وقت کچھ کہا ہے آنسو نکل پڑے ہیں

خوش تو ہوں مرنے سے لیکن اے دعا مستجاب اک ذرا بے وقت یہ ارمان پورا ہو گیا

مجھے احساس کم تھا ورنہ وہ زندگانی میں مری ہر سانس کے ہمراہ مجھ میں انقلاب آیا

سمجھ کر ٹال جانا اور شے ہے ورنہ عالم میں بلا سے مرے آیا ہے مجھ پر جو عذاب آیا

ہزاروں نغمۂ دلکش مجھے آتے تھے اے بلبل مگر دنیا کی حالت دیکھ کر چپ ہو گیا ہوں میں

نیا عالم ہے ابکی بار دل کی نامرادی کا وگرنہ بارہا دنیا میں رہ کر ہنس چکا ہوں میں

اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھکو میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشان ہوں میں

اے بدگمان شدائد دنیا پہ صبر کر فطرت کو تیرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں

پھر بڑھ چلا تلاطم طوفان آرزو حالانکہ ڈوب کر ابھی ابھرا نہیں ہوں میں

شب غم ہوش آتا ہے تو اکثر سوچتا ہوں میں کسے آواز دی تھی میں نے سرگرم فغاں ہو کر

مٹا جاتا ہوں تیرے ساتھ اے بانگ جرس میں بھی جئے کب تک کوئی محو تلاش کارواں ہو کر

زمانہ دوسری کروٹ بدلنے والا تھا مریض درد محبت نے جان ہی دیدی

خار و خس جمع کرے نام نشیمن رکھدے جس کو منظور ہو گلشن کو بیاباں کرنا

اک داغ دل میں اور بڑا داغ کے قریب یہ تم نے کیوں کہا کہ پریشاں نہ ہو جئے

تم نہ سمجھے مری باتوں کو تو شکوا کیا ہے مجھکو خود ہی نہیں معلوم کہ کیا کہتا ہوں

یا سب خموش ہیں مری حالت کو دیکھ کر یا اب جہاں میں کوئی بھی میرے سوا نہیں

اور آگے بڑھ ذرا اے ہمت مردانہ آج ہے کوئی پردہ میں یا آواز ہی آواز ہے

سوچ اے غافل کہ تو قابل زمانے کے نہیں یا زمانہ کی ہوا تیرے لئے ناساز ہے

اس انتخاب سے ہر شخص بہ آسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ آسی کی موجودہ شاعری کا رجحان کیا ہے اور اس کا مستقبل کس قدر شاندار نظر آتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے یہ اندیشہ بھی ہے کہ انحطاط عمر کے ساتھ کہیں یہ واقعات نگاری جو ان کی موجودہ غزلگوئی کا عنصر غالب ہے، خشک طبیعی شاعری ہو کر نہ رہ جائے۔ اس میں کلام نہیں کہ مشاہدات فطرت و اصول فطرت جن جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں، ان کو نظم میں اس طرح لے آنا کہ سننے والے پر وہی اثر پڑے جو کہنے والے کے دل پر ہوا ہے، آسان امر نہیں، لیکن اگر انکو کیفیات محبت سے جدا کر کے بیان کیا جائے گا تو وہ نظم ہونے کے لحاظ سے خواہ کیسے ہی غیر فانی کیوں نہ ہوں، لیکن حدود تغزل سے یقیناً علحدہ سمجھے جائیں گے۔ مثلاً آسی کا ایک شعر ہے:-

رفتہ رفتہ یہ زمانہ کا ستم ہوتا ہے ایک دن روز مری عمر کا کم ہوتا ہے

شعر کے اچھے ہونے میں کلام نہیں لیکن غزل سے اُسے کیا واسطہ - تدبیر کی اہمیت تقدیر کے مقابلہ میں خاص چیز ہے آسی نے اسے یوں ظاہر کیا ہے -

جو کچھ ہے وہ سب مرے ارادوں میں ہے مضمر تقدیر میں اک حرف بھی مرقوم نہیں ہے

ابھی تک اس قسم کے خشک شعر ان کے ہاں زیادہ نہیں ہیں اور اکثر حصہ اُن کے موجودہ کلام کا ایسا ہے جس میں یا تو خالص جذبات محبت کام کر رہے ہیں - مثلاً

آج تکلیف ہوئی دردِ جگر سے آسی اُس نے پوچھا تو کچھ اس نے مجھے کہنے نہ دیا

کیا ہو گیا ہے ہمکو آسی کہ ہم نے اُن سے جس وقت کچھ کہا ہے آنسو نکل پڑے ہیں

یا معنی آفرینی اور فطرت نگاری کے ساتھ اس میں عاشقانہ کیف بھی فعال نظر آیا ہے مثلاً :-

میری سعی اور میری کوشش ہی کیا بہت کچھ کرونگا تو مر جاؤں گا

میر کا بھی ایک شعر اسی مفہوم کا ہے :-

بہت سعی کیجئے تو مر رہئے میر بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

یا ـــــ نہ سنئے مری زندگانی کی کہانی بسر کر رہا ہوں بسر ہو رہی ہے

رنگِ نشاط دیکھ کر مطمئن نہ ہو شاید کہ یہ بھی ہو کوئی صورت ملال کی

الغرض ان کا موجودہ رنگ بہت پاکیزہ ہے اور صحیح معنے میں کیفیات شعر کا حامل - البتہ کہیں کہیں بعض الفاظ کا استعمال بہت تاویل طلب ہو جاتا ہے اور کسی جگہ مفہوم پوری قوت کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا مثلاً ایک شعر ہے :-

ہم نے سمجھا تھا تمنا کا خزانہ لازوال دل کے محسوسات میں آخر کمی ہونے لگی

دوسرے مصرع میں محسوسات بجائے احساسات کے استعمال کیا گیا ہے - حالانکہ ثقیل دونوں ہیں - یا ایک اور شعر ہے :-

جلوہ بیتاب اشاعت ہے حریم ناز میں مرنے والوں کو مقدر آزمانا چاہئے

پہلے مصرع میں لفظ اشاعت ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے - یہ مصرع اگر یوں ہوتا :- "حسن بیتاب تجلی ہے حریم ناز میں" تو بہتر ہوتا - ان کا ایک شعر ہے :-

کرم اے تمکنتِ حسن غریبوں پہ کرم کیا ملیگا انہیں خود بینی و خود آرا کر کے

اس میں معنوی نقص یہ ہے کہ - غریبوں یعنی عشاق (یا خود اپنی ذات) میں "خود بینی و خود آرائی" پیدا ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہے، جو بالکل نامناسب و بے محل ہے -

آسی کا ایک اور شعر نہایت پاکیزہ ہے:۔

صبر پر دل کو تو آمادہ کیا ہے لیکن ہوش اڑ جاتے ہیں اب بھی تری آواز کیساتھ

دوسرے مصرع میں "اب بھی" کے الفاظ کا اقتضاء تھا کہ پہلے مصرع میں صبر وضبط کے اشتداد وامتداد کو ظاہر کیا جاتا۔صرف آمادگی صبر ایسی چیز نہیں کہ اس کے لئے "اب بھی" کا اضافہ کیا جائے۔یہ شعر اگر یوں ہوتا تو بہت بلند ہوجاتا۔

خوگر صبر ہوئے دل کو زمانہ گزرا ہوش اڑ جاتے ہیں اب بھی تری آواز کیساتھ

لیکن اس قسم کے نقائص اول تو بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ غالباً صرف اس وجہ سے ہیں کہ آسی نے ابھی اپنے کلام پر نظر ثانی نہیں کی، آسی نے اور اصناف سخن میں بھی کوشش کی ہے لیکن ان کے ذوق کا پورا حال ان کی رباعیات سے ظاہر ہوتا ہے جو یقیناً خاص چیز ہیں اور کسی آئندہ اشاعت میں ہم نمونۃً انھیں درج کریں گے

نیاز

نادرات

عاقل وہ نہیں ہے جو خیر وشر میں تمیز کر سکے بلکہ وہ ہے جو دو شر میں سے بہتر کا انتخاب کر سکے

غلام کے لئے صرف ایک آقا ہوتا ہے لیکن طماع کے لئے ساری دنیا اسکی آقا ہے۔

دنیا کو عقل انسانی سے اتنا فائدہ حاصل نہیں ہوا جتنا نقصان پہونچا ہے۔

عورت کی کمر جتنی موٹی ہوتی جائے گی، اسیقدر اسکا اعتقاد محبت ضعیف ہوتا جائیگا

قوی چھپاتا ہے اور کمزور ظاہر کرتا ہے

جو شخص سب سے محبت کرنے کا مدعی ہے وہ کسی سے محبت نہیں کرتا۔

عورت ایک بت ہے، مرد اسکی پرستش کرتا ہے لیکن پھر اسے توڑ ڈالتا ہے۔

جو شخص اپنے وطن کی خدمت کرتا ہے وہ نسب سے بے نیاز ہوجاتا ہے

وہ شخص جو دوسرے کی خطا معاف نہیں کرتا، اس پل کو منہدم کرتا ہے جس پر سے وہ گزر رہا ہے

عورت کا امتحان کرو غصہ کے وقت، خوشی کے وقت نہیں

دولت پیدا ہوتی ہے مرد کے ذریعہ سے لیکن صرف ہوتی ہے عورت پر

انصاف مظلوم کے لئے جنت اور ظالم کے لئے دوزخ ہے

ایک عورت کے خاموش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسکا منہ چوم لیا جائے

عورت اپنے پاس کسی چیز کے کم ہونے کا افسوس نہیں کرتی بلکہ اس کو افسوس ہوتا ہے اس بات کا کہ دوسرے کے پاس کیوں زائد ہے

عورت کو کبھی نہ مارو خواہ وہ پھول ہی کیوں نہ ہو۔

جب سودا پسند آجاتا ہے تو خریدار اندھا ہوجاتا ہے۔

جس عورت کے جتنے بڑے بال ہیں اتنی ہی وہ کم عقل ہے

سات سال تک جستجو کرنے کے بعد کسی بات کی تصدیق کرو

نقد الشعر

(۳)

(بسلسلۂ ما سبق)

یہ کہنا بے ادبی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایک کافر کے نسب یا عہد پر فخر کیا ہے شاعر نے اگر اس حدیث کی طرف تلمیح کی ہے ولدت فی زمن ملک عادل تو اس کے دو جواب ہیں :۔

اول۔ محققین کے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں۔

دوم۔ اس سے یہ امر منتج ہوتا ہے کہ آپ نے خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ اس نے آپ کو اس طرح شر سے پاک اور دور رکھا کہ پیدائش بھی ہوئی تو عادل بادشاہ کے عہد میں نہ آپ نے نسب پر فخر کرنے کو مذموم فرمایا ہے اور اس رسم جاہلیت قرار دیا ہے۔

بعض الفاظ میں اضافات اور محذوفات عام طور پر جائز اور جاری ہیں۔ شعرا نے آزادی سے استعمال کیا ہے۔ مثلاً۔ گر اگر۔ ماناا۔ ہمانا۔ می ہمی۔ اکنون۔ کنوں۔ دروں۔ اندروں۔ بروں۔ بیروں۔ فغاں۔ افغاں۔ چار۔ چہار۔ دگر۔ دیگر بتر و بدتر۔ جائے وجا۔ گہ وجاگاہ۔ چناں وچونان۔ خاش وخاموش۔ شاہ وشہ۔ ماہ ومہ۔ راہ ورہ۔ کوتاہ و کوتہ۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں کہ ان میں تصرف عیب کی جگہ حسن پیدا کرتا ہے۔ مثلاً دامن داماں سے، پیرہن پیراہن سے ناگاہ ناگہاں سے فصیح تر اور آگہی آگاہی سے بلیغ تر ہے۔

لفظ میر و امیر میں امیر سے الف گرا کر "میر" کر دینے سے کوئی حرج یا سقم نہیں ہوتا، البتہ اس قیاس پر ابو عبداللہ کا "عبدلی" نہیں ہو سکتا۔

الفاظ لاکن۔ لاک۔ ولے میں لاکن لفظ تازی ہے اصل میں اس کا نون مشدد ہے مگر تخفیف بھی درست ہے، کبھی "نون" کو گرا کر "لاک" کہتے ہیں۔ قدیم فارسی میں "ولیکن" کا استعمال درست مانا گیا رفتہ رفتہ "وکن" حذف کر کے حرف "ولے" رہنے دیا۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو سمجھ لینا چاہئے کہ تازی میں "لیکن" استعمال کرنا مقدوح ہے۔ لفظ لیک بغیر "ے" اور "لام الف" کے لکھنا نہ چاہئے۔

لفظ امین و امینی میں اصل "آمن" ہے "آمن" تازی ہے فارسی میں اس کے ہم معنے کوئی لفظ مفرد نہیں ملتا، امینی کا استعمال فارسی میں اس طرح ہو گیا ہے کہ یہ فارسی کا لفظ ہو گیا، اگر امین کو امینی کی شکل میں لکھیں تو غلط نہ ہوگا اسی طرح کثیر التعداد الفاظ ہیں۔

نوع دوم بعض نامناسب اور ناگوار ترکیبوں کا استعمال، استعارات رکیک، مذموم تقدیم و تاخیر، لغو مطالب کا بیان بھی شعر کو گرا دیتا ہے مثلاً ؎

بساز مجلس و پیش من آر جام نبیذ
ہلا کہ دوست بنا گاہیاں فراز رسید

"ہلا" کے بعد کاف صلہ (کہ) کے استعمال نے دوست کو ہلاکی سے قریب کر دیا دوسرا شعر ہے ؎

خرمن زم غمکان گرسنہ خالی کجا بود　　ما مرغکان گرسنہ ایم و تو خرمنی

اس شعر کا دوسرا مصرع دیکھئے اس میں "لفظ خرمنی" سے ممدوح "گدھا" ہو گیا، اور مدح کرنے والا دھوبی یا کمہار۔

ایک اور شعر ہے ؎

ہوا چو دریا ماہی چو مرغ کشتی پر　　شنا ورانش سیہ زاغکان غرقہ نفوس

اس میں "مرغ چو ماہی" ہونا چاہیے تھا نہ کہ "ماہی چو مرغ"، کیونکہ لفظ دریا موجود ہے سیہ زاغکان غرقہ نفوس کے کیا کہنے ہیں۔ اسی رنگ میں ایک صاحب نے ایک شخص کی تعریف کی ہے ؎

نقا دمیکہ زنور شعاع چشم افتد　　نفیر حشر بود چوں صدائے موسیقار

اس سے زیادہ پر لطف اشعار اور نظمیں اردو میں ان جدید النوع شعرا کی ہیں جو اس وقت دعویٰ اجتہاد کے ساتھ ملک سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں، اور تعریف کرنے والے ادا کرتے ہیں۔ اس قسم کے بہت اشعار ہیں جن کا تفصیلی بیان موضوع کو ناگوار بنا دیگا۔

نوع سوم کسی کی مدح میں اس قدر غلو کیا جائے کہ وہ امر عقلاً محال ہو جائے یا اس سے شریعت اسلام کی توہین ہو۔ انوری کہتا ہے ؎

اگر فنا در ہستی بگل بر اندا یدہ　　ترا چہ باک نہ ذات تو مستعد فناست
وگر بقا نہ بود در جہاں ترا چہ زیاں　　بقا بذات تو باقی نہ ذات تو بہ بقاست

علم کلام کا ایک مسئلہ ہے کہ باری تعالیٰ باقی بالذات ہے یا باقی بالبقا ہے۔ دو گروہوں میں اختلاف ہے انوری کہتا ہے کہ بقا تیری ذات سے باقی ہے۔ عضایری کہتا ہے کہ ؎

صواب کرد کہ پیدا نکرد ہر دو جہاں　　یگانہ ایزدِ دادار بے نظیر و ہمال
دگر نہ ہر دو بہ بخشیدے بگاہ عطا　　امید بندہ نماندے بایزد متعال

نوع چہارم ابتدائے مطلع و قصائد میں ایسا انداز اختیار کرنا جس سے ممدوح کی شان میں بٹا لگ جائے، یا طرز تکلم و خطاب میں بے ادبی و بد تہذیبی ہو اس کی مثالیں بہت ہیں، یہ غلطی اور غفلت ابتدا سے ابتک کیجا رہی ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں مشہور استاد نے یہ کہا ہے لہذا درست ہے اس کو عقل قبول نہیں کرتی

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

اس کے بعد اصناف سخن کے محاسن بیان ہوں گے تاکہ ناظرین نگار کے سامنے تصویر کے دونوں رخ...... آجائیں۔

عیوب شعر و قوافی کے ذکر کے بعد محاسن کا بیان بھی ضروری ہے تاکہ موضوع مضمون تشنہ نہ رہجائے اس امر کا مجھ کو اقرار ہے کہ میرے فاضل اور محترم دوست مولانا نیاز صاحب مدیر نگار نے مجھ کو آمادہ نہ کیا ہوتا تو شاید اس کی تکمیل جلد نہ ہوتی اس لئے اگر یہ مضمون مفید ہو سکے تو قارئین نگار کو مولانا نیاز کا ممنون ہونا چاہئے۔

حسب ذیل محاسن ہیں جو اشعار اور قوافی میں چار چاند لگا دیتے ہیں بلکہ ان کے وجود کے ذمہ دار ہیں۔

تفویف - ترصیع - تجنیس - تکریر - مطابقت - تشبیہ - جمع و تفریق - ایہام - ایغال - تکمیل - اغراق - استعارہ - تمثیل ارورف - تبیین - تغیر - تقسیم - توسیم - تسہیم - تفریع - استطراد - تلمیح - ایجاز - مساوات - بسط - اعتراض التفات - تدارک - تقابل - تاکید المدح بمایشبہ الذم - اعنات - ذو قافیتین - تنسیق صفات - سیاقۃ الاعداد - توشیح - تسمیط - ترجیع - حسن مطلع و مقطع - لطف تخلص - ادب طلب۔

ان کی تفصیل اور تشریح بھی سن لیجئے۔

تفویف لغت میں "تفویف" کے معنے کپڑے میں خط ڈالنے کے ہیں، ثوب مفوف اس کپڑے کا نام ہوگا جس میں خوشنما خط پڑے ہوں۔ اصلاح میں تفویف کے معنے یہ ہیں کہ اشعار میں بہتر وزن، شیریں الفاظ، متین الفاظ۔ درست قوافی سہل ترکیب، لطیف معانی کا انتظام اور التزام ہو تاکہ شعر کے سمجھنے میں اور لطف اُٹھانے میں کسی قسم کی دقت اور تعویق نہ ہو ایک طرف تو ان کا وجود ضروری دوسری طرف استعارات بعیدہ، مجازات شاذ، تشبیہات کاذب اور تخلیات متکررسے احتیاط لازم ہے نظم یا غزل کا ہر شعر بجائے خود مستقل مفہوم رکھتا ہو یہ نہ ہو کہ سمجھنے اور نتیجہ نکالنے کے لئے اور اشعار کی حاجت ہو۔ یہ صورت غزل میں تو بالعموم ہوتی ہے لیکن قصائد میں بھی ہونا ضروری ہے۔ عبارت کہیں پست کہیں بلند نہ ہو، معنوی اعتبار سے بھی اضطراب نہ ہو الفاظ اور قوافی بجائے خود لطف انگیز ہوں یا قصیدہ ہو تو اس میں ایک طرز اور ایک سلسلہ ہو۔ غریب الفاظ سے بچنا اور متروکات سے دور رہنا بھی تفویف میں داخل ہے۔

آج کل فارسی اور اردو کی شاعری بیشتر تفویف سے معمور ہوتی ہے۔ اس کا سبب مذاق اور فن کا فقدان ہے، نظم اور ادب جن ہاتھوں میں ہے اُن کو اس کا معمولی سلیقہ بھی نہیں، سمجھنے اور سننے والے تو کیا محسوس کر سکتے ہیں، اس وبا میں اکثریت شامل ہے۔ کلیہ نہیں ہے۔ انوری کے ذیل کے قصیدے میں آخر الذکر ضروریات موجود ہیں۔ عربی کے وہ الفاظ آئے ہیں جو مستعمل ہیں ؎

اے در ضمانِ عدل تو معمور بحر و بر	وے در مسیر کلکِ تو اسرار نفع و ضر
اے روزگار عدل تو با جبر خاصیت	بجاده از تعرض کاہست بر حذر

اے روزگار عادل و ایام فتنہ سوز	وے آسمان ثابت و خورشید سایہ ور
قدر تو کسوتیست کہ خیاط فطرتش	بر دوختست ز ابرۂ افلاک آستر

رشید کہتا ہے :-

اے در کف عزیمتِ تو خنجر صواب	جانِ عدو سوال، حسام ترا جواب
گنجیست خاطر تو پر از گوہر ہنر	چرخیست فکرتِ تو پر از اختر صواب

ظہیر کہتا ہے :-

گیتی ز فر دولت فرماں دہ جہاں	مانند عرصۂ حرم و روضۂ جناں
بر ہر طرف کہ چشم زنی جلوۂ ظفر	در ہر جہت کہ گوش کنی مژدۂ اماں

یہ تینوں قصیدے طویل ہیں لیکن شروع سے آخر تک ایک رنگ ہے ۔

ترصیع لغت میں ترصیع کے معنے نگینہ جڑنے کے ہیں، اصطلاح میں مسجع کرنے اور الفاظ کو وزن اور حروف میں برابر کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ترصیع کی مثال یہ ہے :-

ان الابرار لفی نعیم ان الفجار لفی جحیم

ابرار کے مقابلہ میں فجار اور نعیم کے مقابلہ میں جحیم میں یہی رعایت اور تناسب موجود ہے ۔ رشید کے اشعار میں ترصیع کا اہتمام دیکھئے :-

اے منور بتو نجوم جلال	وے مقرر بتو رسوم کمال
بوستانیست صدر تو ز نعیم	آسمانیست قدر تو ز جلال
خدمت تو معوّل دولت	حضرت تو مقبل اقبال
در کرامت ترا نبودہ نظیر	در شہامت ترا نبودہ ہمال
تیرہ پیش فضائل تو نجوم	خیرہ پیش شمائل تو شمال
ہمچو اسکندری بہ یمن لقا	ہمچو پیغمبری بحسن خصال
بزمگاہ تو منبع لذات	رزمگاہ تو مجمع اہوال
نہ ملک را از طاعت تو ملام	نہ فلک را ز خدمت تو ملال

الفاظ خط کشیدہ سے ترصیع کا اہتمام معلوم ہوتا ہے، یہ پورا قصیدہ مرصع ہے جس سے شاعر کی قدرت اور مہارت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ آج کل جو لوگ ترصیع کی حقیقت سے واقف نہیں ہر غزل اور ہر قصیدے کو مرصع کہتے ہیں

ترصیع سے ملتا جلتا موازنہ ہے، دونوں میں معمولی فرق ہے، ترصیع کی تعریف ہو چکی،

موازنہ وہ ہے جسمیں حروف خواتیم لفظاً متفق نہ ہوں لیکن سلاست میں ترصیع کا لطف باقی رہے۔ قرآن حکیم میں یہ صنعت بہتر ہے مثلاً

واتینا ہما الکتاب المستبین وہدینا ہما الصراط المستقیم

مستبین اور مستقیم میں موازنہ ہے۔

مسعود سعد کا ایک قصیدہ اس صنعت میں ہے اس کے دو شعر قابل ذکر ہیں:-

شاہے کہ زخش او را دولت بود ذلیل — شاہے کہ تیغ او را نصرت بود فساں
اندر بے کمانش زہ بگسلد یقیں — وندر بے یقینش رہ کم کند گماں

ایک شعر میں موازنہ کا کمال دیکھئے:-

بہ بزم و رزم تو مانند ہمی خزان و بہار — بہ تیغ و کلک تو مانند ہمی قضا و قدر

الفاظ بزم و رزم کے ساتھ تیغ و کلک پھر قضا و قدر میں مناسبت کی باریکی اور موزونیت کی لطافت دیکھئے۔ موازنہ اور ترصیع بالعموم آورد کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ کثرت مشق "آمد" میں بھی یہ رنگ اس طرح نمایاں کر دیتی ہے کہ آورد کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔

ترصیع قصیدے ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ غزلوں میں بھی بکثرت موجود ہے۔ (باقی)

کیفی چریا کوٹی

دواخانہ شفائی نظیر آباد لکھنؤ

سفوف اعجاز۔ صرف نو دن کے استعمال سے تمام ضعیف قوتیں بالکل یقینی طور پر از سر نو واپس آجاتی ہیں اور انسان حیران رہجاتا ہے قیمت ...... عمر

جوب شاہی۔ اسکی ایک گولی کچھ دیر قبل کھا لیجئے اور پھر دیکھئے کہ دواؤں میں کیا کیا طلسمی اثر چھپے ہوئے ہیں شیشی ۲۰ گولی عگر

روغن اعجاز۔ اگر سفوف اعجاز کے ساتھ ۲۱ دن تک اس روغن کا بھی استعمال کر لیا جائے تو پھر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ناقابل ہے صرف اس روغن کا استعمال بھی اپنی جگہ اکسیر کا حکم رکھتا ہے قیمت عگر

سفوف نادر۔ یہ سفوف خاص وقت میں ایک مرتبہ استعمال کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لطف کیفیت سے غشی کی سی نوبت آجاتی ہے قیمت ۱۲ر

نمک اعجاز۔ یہ بالکل نئی چیز ہے اور چودہ دن کے استعمال سے ایک شخص کو معلوم ہوجاتا ہے کہ حقیقتاً جوانی کس کا نام ہے۔ قیمت عمر

الائچی طلسمی۔ یہ چیز سوائے ہمارے دواخانہ کے کہیں نہیں مل سکتی پان میں معمولی الائچی کی طرح استعمال ہوتی ہے اور چودہ دن کے بعد ایک شخص تمام دواؤں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اگر آپ مایوس ہو چکے ہیں تو اس کو منگا کر استعمال کیجئے قیمت عگر

(ملنے کا پتہ:- منیجر دواخانہ شفائی نظیر آباد لکھنؤ)

تسکین جاوید

ستم کش ہوں، جفا پروردہ ہوں، ناکام عشرت ہوں
میں اک بیگانۂ آرام ہوں محروم راحت ہوں
محبت نے مٹا رکھا ہے ـــــ مجبور محبت ہوں
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

خلش آباد ہے گو میرے محسوسات کی دنیا
ہجوم بیکسی ہے اور مرے جذبات کی دنیا
یہ دنیا ہو گئی میرے لئے آفات کی دنیا
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

برہمن کو مری وحدت پرستی سے شکایت ہے
کلیسا کو مری عصمت پرستی سے شکایت ہے
تو شیخ کعبہ کو فطرت پرستی سے شکایت ہے
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

نہ رفتار زمیں میری نہ دور آسماں میرا
سمجھتا ہوں کہ شاید ہو گیا دشمن جہاں میرا
دل آزاروں کے ہاتھوں لٹ رہا ہے کارواں میرا
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

ہلاک ذوق بھی ہوں نامراد جستجو بھی ہوں
فریب آرزو سے شرمسار آرزو بھی ہوں
چمن میں بھی ہوں اور محروم کیف رنگ و بو بھی ہوں
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

یہاں تک ہوش والوں نے بنایا مجھکو سودائی
کہ تیری بزم تک جانے لگی ہے میری رسوائی
مری فطرت پرستی کو کہا جاتا ہے "ہرجائی"
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

مری بربادئ قسمت کا ہر ذرہ ہے فریادی
مری مجبوریوں نے لوٹ لی ہے میری آزادی
ادھر دیکھوں تو بدبختی ادھر دیکھوں تو بربادی
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

میں گم گشتہ ہوں اور ہر رہنما بیزار ہے مجھسے
تلاطم اوج پہ ہے ناخدا بیزار ہے مجھسے
زمیں ناراض ہے مجھسے فضا بیزار ہے مجھسے
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

مری تخئیل ہے، بیکار تدبیروں سے وابستہ
مری تدبیر ہے، ناکام تاثیروں سے وابستہ
مری تاثیر ہے، قسمت کی زنجیروں سے وابستہ
مگر تو ہے تو کیا غم ہے

بنایا حسرتوں نے میرے دل کو اپنا گہوارہ
نہ وہ فردوس عشرت ہے نہ وہ خلد نشاط آرا
مری آنکھیں ہیں اور ناکامیوں کا تلخ نظارہ
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

قدم مضمحل ہیں اور منزل دور ہے مجھسے
میں ہوں اک موجۂ آوارہ ساحل دور ہے مجھسے
قدم اُٹھتے نہیں اور تیری محفل دور ہے مجھسے
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

روش صدیقی

دامنِ کوہ

کوہ کے دامن میں تھا اک روز میں محوِ خرام
کائناتِ دل ہوائے دہر سے پُر اضطراب

فطرتِ زرکار کی نیرنگیاں تھیں جلوہ زا
تھا چراغِ لالہ روشن اور نرگس محوِ خواب

شاخِ گلبن پردہ در دیدہ نگاہِ چشمِ گل
ایسی تھی جیسے نکل آئے چمن میں ماہتاب

آبشاریں اس طرح وادی میں تھیں نظارہ سوز
جیسے پانی ہو کے بہ جائے شعاعِ آفتاب

قطرۂ شبنم درخشاں اس طرح تھے پھول پر
جس طرح تاریکیٔ شب میں چمکتا ہے شباب

برف تھی وقفِ روانی موج کے گہوارہ میں
کس قیامت کا سماں تھا یہ طلسمِ سیم و آب

یاسمن، ریحان و سوسن، ارغواں و موتیا
یہ تھے واں دیوانِ فطرت کے نظر افروز باب

دامنِ کہسار کا منظر تھا اتنا دل فریب
دردِ دلِ نظارگی نے صبر ماندہ نے شکیب

غلام ربانی عزیزؔ

واردات

مکاں کمانِ خدنگِ کماں زمانہ ہوا
فلک کے جور کا دل جب کہیں نشانہ ہوا

عدم سے آنیکو بیتاب میں نہ تھا لیکن
پکڑ کے مجھکو یہی خود نما روانہ ہوا

الٰہی اس کی ہے بالیدگی قیامت کی!
بلند طوبیٰ و سدرہ سے بھی یہ دانہ ہوا

بلا کو ذوقِ نظر کیا ملا! بقول کسے
سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا

اسی نے چھیڑ دیا حسن و عشق کا قصہ
کہیں تو زلف بنا اور کہیں یہ شانہ ہوا

یہ شمع وہ ہے کہ ہے جسپہ مہر و ماہ کو رشک
کہ ایک اسکو عطا سوزِ جاودانہ ہوا

یہی وہ قطرۂ شبنم ہے اے امینؔ حزیں
ٹپک کے جو گلِ ہستی پہ بیکرانہ ہوا

امین حزیں

شاعر کا ترانہ

عجب اک عالم کیف ولطافت ہے مری دنیا
شفق کا رنگ ہے پھولوں کی نکہت ہے مری دنیا

مری اقلیم کی وسعت زمین سے آسماں تک ہے
مرے تخئیل کی رفعت حدودِ لامکاں تک ہے

جو آنکھیں بند کرکے چشم باطن کھول کر دیکھوں
تو ہر ذرے میں صحرا ہر ستارے میں قمر دیکھوں

اگر چاہوں تو پرواز تخئیل کی لطافت سے
نکل کر میں دکھادوں عالم امکاں کی وسعت سے

کبھی جھیلوں سے دلچسپی کبھی دریا سے دلچسپی
کبھی خلوتکدوں میں ساغر و مینا سے دلچسپی

کبھی بے حاصلی میں روز و شب برباد ہوتا ہوں
کبھی بے کار ہنستا ہوں کبھی بے کار روتا ہوں

رباب دل سناتا ہوں پہاڑی آبشاروں کو
تخئیل کے پروں پر اڑ کے چھو آتا ہوں تاروں کو

میں اکثر رات کی تنہائیوں میں اُٹھ کے روتا ہوں
نمِ گریہ کے آبِ گرم سے دامن بھگوتا ہوں

مرے کانوں میں شب کو وہ ندائے درد آتی ہے
جو سازِ دل کے ہر نغمے کو آکر چھیڑ جاتی ہے

یہ وہ نغمے ہیں جن میں اس قیامت کا ترنم ہے
کہ معنے کچھ نہیں پھر بھی سماعت کیف میں گم ہے

غرض اک راز پنہاں ہے یہ سرشاری یہ مستی
کبھی پستی میں رفعت ہے بلندی میں کبھی پستی

مرے مانند دیکھا کر مناظر چشم حیرت سے
فضائے قلب کو لبریز کر وجدان فطرت سے

نوائے شوق سے بھر دے رباب دل کے تاروں کو
نظر میں جذب کرلے ساری دنیا کی بہاروں کو

حقائق سب عیاں ہو جائیں گے رندی و مستی کے
بلندی کی طرف لے جائیں گے جذبات پستی کے

(ذوقی)

خوشی اور غم

چمک اے برق ہاں اک بار پھر تو بادم تازہ
جھجک سے تیری تاریکی کا ہو جاتا ہے اندازہ

نظر پر ہو گئیں قصر الم کی ظلمتیں روشن
خوشی کی اک جھلک کے واسطے کھلتے ہی دروازہ

حامد اللہ افسر بی اے

غزلیات

آزاد انصاری

لطف کی آنکھوں سے کیا دیکھا کہ دم پر آبنی
ہائے جزاک اللہ اچھا لطف کا انداز تھا

ہم کسی سے بات کیا کرتے کہ شرم ضبط تھی
ہم کسی سے درد کیا کہتے کہ دل کا راز تھا

آپ کے الطاف کیا تھے جور کی تمہید تھی
آپ کی امید کیا تھی یاس کا پرواز تھا

تیرے انداز ستم بھی لطف سے خالی نہیں
برہمی کیا تھی کہ خاصا التفات ناز تھا

اکبر حیدری

یہ ستم - اک خواہش موہوم پر ؟
لطف فرما خاطر مغموم پر !

اے مسرت میرے غمخانے سے دور
یہ گرانی اور میرے مقسوم پر ہو

پرسش حالات غم سے درگزر
رحم فرما اب دل مرحوم پر ہو

صبر کرتی ہی رہی بے چارگی
ظلم ہوتا ہی رہا مظلوم پر

اک تبسم تھا جواب آرزو
وسعتیں قرباں ہوئیں مفہوم پر

ابتدائے غم کی دور اندیشیاں
شاد ہوں انجام نامعلوم پر

آج تک اکبر ہوں میں ثابت قدم
جادۂ خودداری موہوم پر

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

یوں ہی نہ بہلا دے کوئی آئین وفا کے
کیا جانے ملا کیا انہیں بیکس کو رلا کے

سب قتل کی حسرت ہی لیے مر گئے آخر
بے درد نے دیکھا بھی نہیں آنکھ اٹھا کے

عبرت ہی کو رہنے دو یہ ٹوٹی ہوئی قبریں
کیوں نقش مٹاتے ہو مزار شہدا کے

سر تھام کے بیٹھے تو جگر تھام کے اٹھے
اس دل نے اٹھایا یوں ہیں سو بار بٹھا کے

بے سود ہے آہ سحری اے دل صد چاک
پھولوں کو کوئی گوندھتا ہے رات بسا کے

سنتے تھے اثر کو کہ ہیں وہ عقل کے پتلے
لو آج چلے آتے ہیں دل مفت گنوا کے !

تبسم نظامی

اس ضد کو کیوں مبالغۂ دل کہا نہ جائے
قاتل اُسے کہوں جسے قاتل کہا نہ جائے

طوفانِ التجا ہو، جو یہ رو پوش تو رہے
او رحالِ زار تیرے مقابل کہا نہ جائے

اس درجہ آشنائے محبت بنا مجھے
نقش خیال کو مرے باطل کہا نہ جائے

مرنا بھی اس کے ہجر میں دشوار ہو گیا
اب موت کو بھی عشق کا حاصل کہا نہ جائے

وہ لطف چاہتا ہوں میں اسکی نگاہ سے
جس کی طلب کو درد کا حاصل کہا نہ جائے

کیا کیا کہا نہ جائے اُسے پیش آئینہ
دلکش کہا نہ جائے کہ قاتل کہا نہ جائے

ہو جائے وقفِ گریہ تبسم خدا کرے
دیوانۂ تبسم قاتل کہا نہ جائے

جگر بریلوی

وہ برق جلوہ کہاں اور کہاں یہ خرمنِ ہوش
سمجھ کے حالت دل ہو گیا کوئی روپوش

نگاہِ ساقی مدہوش نے کر دیا بے ہوش
فضا میں گونج رہی ہے صدائے نوشا نوش

یہی ہے رمز محبت یہی ہے راز فنا
برنگ برق طپاں رہ برنگ باد خموش

ابھی تو شور قیامت لگی تھی آنکھ مری
جگا کے چھیڑ دیا پھر وہی فسانۂ دوش

کسی کا ذکر زباں تک ابھی نہ آیا تھا
بھڑک کے شمع صفت ہو گیا کوئی خاموش

وہ آئی نزع کی ہچکی بدل گئی دنیا
مریض ہجر کہاں ہے ترا وہ جوش و خروش

جگر کو دیکھ کے اہل نظر یہ کہتے ہیں
جہان ساتھ لئے پھر رہا ہے خانہ بدوش

حافظ غازیپوری

صدائے بازگشت آتی نہ ہو یہ آرزو میری
خدا جانے سناتی ہے مجھے کیا گفتگو میری

جہاں سے دیکھتا ہوں میں فروغ منظر فطرت
صلائے ہوش دیتی ہے تمنائے نمو میری

عجب پرکیف دور نیم شب تھا یاد جاناں میں
کہ رقص حسن انجم بن گئی ہر آرزو میری

فضائے گل میں جب بکھرے نظر آئی ترمی جلوے　فضائے رنگ و بو ہو ہو کی نکلی آرزو میری
گذر جا مست و بیخودی بچاکر اپنے دامن کو　بھری ہی ساغرِ دل میں شراب تند خو میری

تلاشِ حسن میں مجکو ملا غم کا نشاں حافظ
فنائے عشق ہوکر کام آئی جستجو میری

کیفؔ مرادآبادی

دل پھر ہے ایک حشرِ تمنا لئے ہوئے　قطرہ ہے پھر کنار میں دریا لئے ہوئے
رسوائی خیال کی اللہ رے احتیاط　مدت ہوئی ہے نام تمھارا لئے ہوئے
میں اور تم سے ہر کرم و لطف کی امید　تم اور مجھ سے رنجش بیجا لئے ہوئے
اب دیکھتا ہوں کون رہیگا حجاب میں　میں جا رہا ہوں ذوق تماشا لئے ہوئے
میری نگاہ شوق کا یہ جوش دیکھنا　اُٹھے حریم ناز کا پردا لئے ہوئے

پھر چھیڑتا ہے تار رگ جاں کو کوئی کیفؔ
ہاتھوں میں ایک تیز سا دشنہ لئے ہوئے

کیفی چریاکوٹی

بمحشر آں ستمگر نزد تو یارب چہ جا دارد　کہ از خون شہیداں شوخیش رنگیں قبا دارد
زحسن و عشق چیزے با رقیباں کے تواں گفتن　نہ حسنش ابتدا دارد نہ عشقم انتہا دارد
نمی دانم کہ با چارہ گراں از خویش چوں سازم　دلم درد تو می دارد، اگر دارد بجا دارد
بگرداب بلا ہر کس بقدر ہمتش کوشد　حریفاں ناخدا دارند و دل یاد خدا دارد
بہ بختِ عاشق بیتاب تدبیرے نمی گنجد　بنازم ہمتِ دل را کہ درد لا دوا دارد
ہمیدانم کہ جانِ ناتوانِ من بہ تن باند　نمی دانم صبائے کوئے او باخود چہا دارد
بہ شست و شوئے طوفانِ سرشکم ہم بجا ماند　مگر داغ جبینِ من عجب رنگ وفا دارد
بہ فکر روزگارے اوست و دل را نیست پروائے　زشاہے، ایں گدائے بینوا شانے جدا دارد
دلم در سینہ و درد فراق تو بدل باشد　ببیں جانباز عاشق چوں بلا اندر بلا دارد
بہ سر سودا و در دل شوق و حسنش در نظر زیبد　اگر عاشق جز ایں دارد چہا دارد کجا دارد

منم چون شبنم و آں صورتِ مہر جہانتابے　　نگاہِ شوخ باید، شکوۂ عاشق چرا دارد
بجانم می خرام و سوئے چشم جلوہ می افگن　　کہ ایں شوقِ جدا داں لذت و لطفِ جدا دارد
زکیفی، دین و دل ہر دو خدایت ہیچ می پرسی
دو عالم را نمی خواہد کہ او شوقِ شما دارد

اب بھی وقت ہے

کہ آپ "ظریف شاعروں کا تذکرہ" نصف قیمت پر حاصل کر سکیں۔ یہ تذکرہ تقریباً ۴۰۰ صفحات پر شائع ہوگا اور اس کی قیمت (للعہ) چار روپیہ سے کم نہ ہوگی، لیکن اگر آپ نے اشاعت سے قبل دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدئے تو آپ اتنی ہی رقم میں اس کے پانے کے مستحق ہو جائیں گے۔ یہ تذکرہ اس قدر مکمل، دلچسپ اور نئی چیز ہے کہ زبان اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔

سیکڑوں ظریف شاعروں کے حالات، ان کے لطائف و ظرائف اور ان کا بہترین ظریفانہ کلام جو ہزاروں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی آپ کو نہیں نظر آسکتا، برسوں کی محنت و کاوش کے بعد ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے اور آپ اشاعت سے قبل اُسے صرف دو روپیہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اشاعت کے بعد پھر کوئی رعایت نہیں ہوگی۔ یہ کتاب سوائے ہمارے اور کہیں نہیں مل سکتی تھوک فروش ایجنٹ اور کتب فروش اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ورنہ اشاعت کے بعد ان کو زیادہ سے زیادہ (۲۰) فیصدی کمیشن ملیگا بغیر روپیہ وصول ہوئے کوئی آرڈر درج رجسٹر نہیں کیا جائے گا۔

منیجر نگار۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ

باب الاستفسار

(ز ـ خاتون ـ رائے بریلی)

مجھے نگار کے خریدار ہونے کا فخر تو حاصل نہیں ہے لیکن اتفاق سے کل اپنی ایک عزیز بہن کے پاس آپکے رسالہ کا مکمل فائل دیکھنے کو ملگیا ـ آپ یقین کیجئے کہ مجھے کبھی اس رسالہ سے دلچسپی نہیں ہوتی، جسمیں ہماری جنس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہو، اس لئے یہ دیکھکر تو مجھے مسرت ہوئی کہ آپ کبھی کبھی نسائیات پر گفتگو کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ حیرت بھی ہے کہ آپ کے خیالات بعض مسائل میں متضاد نظر آتے ہیں ـ

آپ ایک طرف اس کے بھی مخالف ہیں کہ عورتیں انشاء لطیف کی طرف متوجہ ہوں اور دوسری طرف پردہ کے بھی زیادہ حامی نظر نہیں آتے، تعلیم اور بلند تعلیم کے بھی طرفدار ہیں، پھر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد اگر عورتیں آزادی کے ساتھ تعلیم حاصل کرینگی تو ان بعض افراد کے لئے جن کی فطرت انشاء لطیف کی طرف مائل ہے کیونکر افسانہ نگاری یا غزل نگاری سے باز رہ سکتی ہیں اور جب مردوں کے لئے اس میں کوئی قباحت تسلیم نہیں کیجاتی تو عورتیں کیوں باز رکھی جائیں ـ خدا کے لئے یہ معمہ حل کیجئے اور زحمت نہ ہو تو جواب سے ممنون فرمائے

(نگار) محترمہ ـ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نگار کی جلدوں کا مطالعہ زیادہ سرسری (نسائی) انداز سے کیا ہے ورنہ آپ میرے اقوال میں تضاد محسوس نہ کرتیں ـ میں مروجہ پردہ کو یہی نہیں کہ اچھا نہیں سمجھتا بلکہ اس کو عورت کی توہین سمجھتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک وہ عورتیں جن کو "عفت وحیا"، کا درس دینے کے لئے سنگین حصار اور اجباری پردہ کی ضرورت ہے ہرگز اپنی پاکیزگی اور نسائیت پر فخر نہیں کر سکتیں، پردہ نام ہے حیا کا اور حیا کی تعریف "غض بصر" کی گئی ہے ـ اگر ایک عورت زنداں کے اندر رہنے کے بعد اس صفت سے خالی ہے تو تمام قید و بند بیکار ہے اور اگر برافگندہ نقاب ہو کر وہ اس خصوصیت کی مالک ہے تو اُس کو "پابزنجیر" کیوں کیا جائے ـ پردہ اُٹھ جانے کے بعد فتنۂ و فساد کا احتمال بہت ہے ـ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ـ کیونکہ انسان کا "نفسیاتی" میلان یہی ہے کہ وہ ہر اس چیز کی خواہش کرے جو اُس سے دور ہے، اس کے لئے عسیر الحصول ہے ایک عورت برقعہ کے اندر دیدہ و دل کو جس قدر بیتاب بنا سکتی ہے وہ کشف حجاب کے بعد ممکن نہیں ـ ہندوستان کی پردہ نشین خواتین اگر آج سب کی سب بے نقاب ہو جائیں تو یقیناً ان میں سے ۸۰ فیصدی ایسی ہونگی جو کوئی توجہ حاصل نہ کر سکیں گی ـ (حالانکہ زیر نقاب رہنے کی حالت میں یہ بھی اگر مرکز نگاہ نہ تھیں تو مرکز خیال

ضرور نہیں) پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ فتنہ و فساد کا احتمال کس حالت میں زیادہ ہے اور اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کا کیا جواب ہے کہ اس اندیشہ سے جو نسل کی نسل تباہ ہوتی جا رہی ہے اس کا ذمہ دار کس کو قرار دیا جائے گا۔

عورتوں کا ضعیف و کمزور رہنا، امراض میں مبتلا پایا جانا، دنیا کی رفتار سے بے خبر رہنا، مطالعۂ فطرت سے محروم رہنا، حقائق فطری کا نہ ہونے کی وجہ سے اوہام میں مبتلا رہنا، بے سلیقہ ہونا، غیر نفیس زندگی بسر کرنا، اور ان نقائص کی وجہ سے بچوں کی صحیح تعلیم اور صحیح تربیت نہ کر سکنا، کیا آپ کے نزدیک یہ ایسی معمولی باتیں ہیں جن کے دور کرنے کے لئے پردہ کی قربانی (ایک ایسی رسم کی قربانی جو شرعاً و اخلاقاً کسی طرح ہم پر عائد نہیں ہوتی) کوئی بڑی چیز ہے۔

عورتوں کے بے پردہ ہونے کا سب سے پہلا لازمی اثر یہ ہوگا کہ وہ صاف ستھرا رہنا سیکھیں گی۔ گھر کی چیزوں کو سلیقہ و ترتیب سے رکھیں گی، معاشرت میں صفائی و پاکیزگی پیدا ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سوسائٹی میں اخلاقی مرتبہ بلند ہو جائیگا اور جو بچے اس ماحول میں پرورش پائیں گے وہ بھی پست خیال نہ ہوں گے۔ ایک عورت اپنے گھر کے اندر جہاں اُس کو یقین ہے کہ کوئی غیر شخص آ کر تنقیدی نگاہ نہیں ڈال سکتا بدتر سی بدتر حالت میں رہ سکتی اور اُسے میلے کپڑے، کثیف گھر، منتشر و بے ترتیب چیزوں کی طرف بھی توجہ نہیں ہو سکتی، لیکن یہ جاننے کے بعد کہ یہاں کوئی غیر بھی آ سکتا ہے وہ کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتی اور اُس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ خود بھی صاف رہے، بچوں کو بھی صاف رکھے گھر کی چیزوں میں ترتیب و سلیقہ پیدا کرے، انگریزوں کے ہاں جو آپ کو ہر گھر فردوس کا ٹکڑا نظر آتا ہے اس کا یہی سبب ہے۔ میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ چونکہ عیسائیوں کی مالی حالت ہندوستانیوں سے اچھی ہے اس لئے وہ ایسی معاشرت کے پابند ہو سکتے ہیں، کیونکہ آپ غریب عیسائیوں کا مقابلہ اپنے ہاں کے امراء کی معاشرت سے کر کے دیکھیے تو بھی یہی فرق نظر آئے گا۔ علاوہ اس کے محض سلیقہ اور صفائی کے لئے روپیہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمیز اور احساس کی ضرورت ہے، اور اسی کا ہندوستان کی عورت میں فقدان ہے۔

ایک نقص ہمارے ہاں کی عورتوں میں یہ بھی ہے کہ ان کا وقت اکثر بیکاری اور تعطل میں گزرتا ہے جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُن کے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ اگر بچوں کی تعلیم و تربیت کا اُن کو سلیقہ حاصل ہو، امور خانہ داری میں ان کو ترتیب و تہذیب پیدا کرنے کی فکر ہو، گھر کی صفائی ستھرائی کا خیال ہو، زنانہ دستکاری سیکھنے کی طرف ان کو توجہ ہو تو انکا ایک لمحہ بیکار نہیں جا سکتا۔ لیکن ان باتوں کی طرف توجہ ہو ہی نہیں سکتی جب تک الزام یا تنقید کا ڈر نہ ہو اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح تنقید غیر ہی کر سکتا ہے۔

پردہ اٹھا دینے کے یہ بالکل ابتدائی فوائد ہیں جو میں نے بیان کئے، رہا تعلیم کا مسئلہ سو اس کے متعلق میں اپنے خیالات تفصیل کیساتھ نگار میں بیان کر چکا ہوں اُن کو ملاحظہ فرمائیے۔

میں یہ کبھی نہیں چاہتا کہ ہندوستان کی عورتیں اپنے بطون کے لحاظ سے یوروپین ہو جائیں، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اُنکے عمدہ خصائل اختیار کریں۔ تعلیم کا اثر کبھی کسی پر خراب نہیں ہوتا، خواہ وہ مشن اسکول میں ہو یا کسی اور جگہ۔ اصل چیز جو زندگی کو تباہ کرنے والی ہے وہ تربیت کا نقص ہے جس کی سب سے پہلی ذمہ دار ماں ہے اور ماں اسی وقت اچھی تربیت کرنے والی ثابت

ہوگی جب خود اس کے اخلاق بلند ہوں، معاشرت پاکیزہ ہو، وقت کی قدر شناس ہو، اصول صحت سے واقف ہو، رسم و رواج اور اوہام کی پابند نہ ہو۔ اس لئے اس وقت سوال لڑکیوں کی تعلیم کا نہیں ہے بلکہ ماؤں کی تعلیم و تربیت کا ہے اسلئے اب پختہ عمر میں انکے روشن خیال بنانے کا ذریعہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان کو مکان کی چار دیواری سے باہر نکالا جائے اور مطالعۂ عالم کا موقعہ دیا جائے

میں بیشک اس کے خلاف ہوں کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر عشقیہ فسانہ نگاری اور غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوں، کیونکہ اول تو اُن کی تعلیم اس قدر معمولی ہوتی ہے کہ وہ پوری طرح اچھے بُرے فسانہ یا غزل میں تمیز ہی نہیں کر سکتیں چہ جائیکہ خود لکھنا، دوسرے یہ کہ وہ لڑکی جسکی تعلیم کا نتیجہ اس طرح ظاہر ہوگا۔ اس کے متعلق عملی دنیا میں کوئی اچھی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی مردوں کے لئے اگر اس کو جائز قرار دیا جاتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ہر نوع اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے اور اُن کو پورا کرنے پر مجبور ہے، علاوہ بریں اس کی غزلگوئی یوں ہی اس قدر لایعنی و لغو سی بات ہے جس کا کوئی اثر اُس کی زندگی پر نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ اس کے حال سے بالکل علحدہ چیز ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے ایک عورت اگر غزلگوئی کی طرف مایل ہوگی تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ وہ حقیقتاً ایک کیفیت سے متاثر ہے اور اگر اس تاثر کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس کا اثر نہ صرف ازدواجی و مادری زندگی بلکہ سوسائٹی پر بھی پڑے گا البتہ اگر کوئی خاتون اپنی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بلند ہوگئی ہے اور فطرتاً اُس کو نابغۂ ادب پیدا کیا ہے تو چنداں حرج نہیں لیکن سوال تو صرف یہ ہے کہ عام طور سے جو یہ ذوق آج کل کی لڑکیوں میں پیدا ہوتا جاتا ہے وہ کس حد تک جائز ہو سکتا ہے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے ان خرابیوں کا بڑا سبب علاوہ نقص تربیت کے نقص تعلیم بھی ہے۔ جہاں کسی لڑکی کو کچھ پڑھنا لکھنا آیا وہ فطرتاً قصہ کہانیوں ہی طرف مائل ہوتی ہے اور اس کے والدین اس خیال سے کہ اچھا ہے اسی طرح کچھ لکھنے پڑھنے کی مشق ہو جائے مزاحمت نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ذوق گندہ لٹریچر کے سامنے رہنے سے آہستہ آہستہ مگر نہایت مہلک طور پر نشوونما پاتا رہتا ہے اور آخر کار ذوق میں ایسی زہر آلود تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر اس کا علاج دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر شروع ہی سے اسکا انتظام کیا جائے کہ لڑکیوں کے سامنے جو لٹریچر آئے وہ مفیدِ ذہن و دماغ، مصلحِ معیشت و معاشرت ہو تو کبھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہو سکتی۔

اس وقت زنانہ نصاب کی بہت سی کتابیں پائی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض نہایت خوب ہیں اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے بنگالی ناگن، طرحدار لونڈی، میٹھی چھری دیکھنے کی اجازت اُن کو دیجائے۔

ضرورت ہے

جولائی، اگست ۲۷ء و فروری ۲۸ء کے نگار کی

منیجر نگار لکھنؤ

معلومات

برقیاروں کے عجائب

۱۸ ؍ جون سنہ ۱۸۱۵ء کو نپولین اور ولنگٹن، واٹرلو کے میدان میں متصادم ہوتے ہیں اور سارا یورپ نتیجہ کا منتظر ہے اسی دن نو بجے رات کو سارے یورپ کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور نپولین کو شکست ہو جاتی ہے۔ انگلستان جو صرف ۲۰۰ میل کے فاصلہ پر تھا تمام دن اس حقیقت سے بے خبر رہتا ہے کہ اس کی فوج دن بھر کس قدر سخت جنگ میں مبتلا رہی۔ ۱۹ ؍ کو بھی اسے کوئی علم نہیں ہوتا۔ ۲۰ ؍ کی شام کو کچھ حال معلوم ہوتا ہے اور تین دن بعد ۲۱ ؍ کو ولنگٹن کی تحریر سے مفصل کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ امریکہ کو اس کا حال تین ہفتہ کے بعد اور آسٹریلیا و نیوزیلینڈ کو اس سے بھی زیادہ انتظار کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ یہ حال سنہ ۱۸۱۵ء کا تھا۔ لیکن اب سنہ ۱۹۲۶ء کو ملاحظہ کیجئے ۱۹ ؍ اگست سنہ ۱۹۱۲ء کو ساکو اور وانزٹ کا برقی تصاص ہوتا ہے اور ۹۰ سکنڈ میں ساری دنیا اس سے آگاہ ہو جاتی ہے۔ یعنی سنہ ۱۸۱۵ء میں جتنی دیر ایک سوار کو اپنے گھوڑے پر سوار ہونے میں لگتی تھی، اتنے عرصہ میں اب بحر و بر کے ہزاروں میل طے ہو جاتے ہیں۔

ایک معصوم صورت انسان بمبئی سے عدن جانے کے لئے جہاز پر سوار ہوتا ہے، وسط بحر میں جہاز جا رہا ہے اور وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا ہوا باتوں میں مصروف ہے کہ دفعتہً ایک شخص آکر اس کے ہاتھ میں ہتکڑی ڈال دیتا ہے کیونکہ وہ بمبئی سے کوئی جرم کر کے بھاگا تھا اور عدن پہونچنے سے قبل ہی لاسلکی کے ذریعہ سے سارا حال جہاز کے کپتان کو معلوم ہو گیا تھا۔

اب سے ایک صدی قبل کسی خوش منظر مقام دیکھنے کے لئے سیکڑوں میل کا سفر کرنا پڑتا تھا لیکن اب وہ گھر کے دروازہ ہی پر عکاسخانہ میں موجود ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ تم ہندوستان میں بیٹھ کر لندن کی آواز سُن سکتے ہو اور وہاں کا ڈراما دیکھ سکتے ہو۔ یہ ان ہزاروں مثالوں میں سے چند مثالیں ہیں جو برقیاروں کی بدولت ظہور میں آ رہی ہیں۔ لاسلکی ٹیلیفون، تصاویر متحرکہ برقی روشنی، کہربائی قوت، طیارے، جہاز، اور تمام وہ مقامات جہاں مشین کا چھوٹے سے چھوٹا پہیہ بھی گردش کر رہا ہے، سائنس اور طبیعیات ہی کی ترقی کے ممنون ہیں۔

اس صدی میں طبیعیات اور کیمیا نے جن عجائب و غرائب کو دنیا میں منتشر کر دیا ہے وہ حقیقتاً خیال انسانی سے بھی کچھ بلند نظر آتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ ابھی تک اس کی انتہا ہمارے سامنے نہیں آئی اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس ترقی کی آخری منزل کیا ہوگی۔

اب زمانہ قدیم و قدامت کا نہیں رہا۔ ہر چیز جدید ہے، اور جدت و ندرت "ابداع و اختراع ہی کی حکومت دنیا میں قائم ہوگی، فضائے آسمانی کی تحقیق، اثیر کی جستجو، نئی نئی شعاعوں کی تحقیقات، نئی نئی قوتوں کی تلاش ماہیات و حقیقیات کی

تفتیش جاری ہے اور ہر چند ہمیں یہ سنکر حیرت ہوتی ہے کہ کائنات کے ایک ایک ذرہ میں پورا نظام شمسی پایا جاتا ہے۔ لیکن ہم انکار کی کوئی وجہ بھی نہیں پاتے اور اگر کل کو کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ صرف ایک ذرہ کی مدد سے ساری دنیا کو ہلاک کر سکتا ہے تو ہمیں اسپر بھی ایمان لانا پڑے گا، کیونکہ ہم لوگ جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ صرف سجود و نیاز کی دنیا ہے اطاعت و فروتنی کی فضا ہے، عجز و درماندگی کی سرزمین ہے اور ہم کو اُن کے مقابلہ میں چون و چرا کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

ہمارے ہاں کے مولوی خواہ کتنے ہی برہم ہوں، لیکن اگر اُنھیں کبھی انگلستان یا فرانس جانا پڑا تو مسجد کی اذان اُنہیں مائکروفون اور لاسلکی مکبرۂ صوت ہی سے سننی پڑیگی اور اگر ان کی نسل منقطع نہ ہوگئی، تو حج بھی اسی طرح لاسلکی ہوا کریگا اور گھر بیٹھے عرفات و منیٰ کے میدان سامنے آجایا کریں گے۔

پھر اگر مذہب اور یہ مذہب موجودہ ارتقاء کا ساتھ نہیں دے سکتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس میں قابل الزام کون قرار دیا جائیگا؟ وہ جسنے گھر بیٹھے بغیر کسی زحمت کے لاسلکی حج کر لیا یا وہ جس نے مذہب کے حدود کو وسیع نہ کر کے تمام مہذب دنیا کیلئے اس کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

جاپان کی صحافت

اگر کسی قوم کی حالت کا صحیح اندازہ کرنا ہو، تو اس کی صحافت پر غور کرو جس سے تم کو ان کی فردی و اجتماعی زندگی، ان کے عزائم و آمال اور ان کے اخلاق و عادات کا بخوبی علم ہو سکتا ہے۔ اس لئے تمدن جدید میں سب سے بڑی قوت جس سے کسی متنفس کو انکار نہیں ہو سکتا، صحافت کی قوت ہے۔

یورپ میں بلا استثناء تمام ممالک اس لحاظ سے بہت ترقی یافتہ ہیں اور ان میں جرائد و رسائل کی کثرت اب اس حد سے بڑھ گئی ہے کہ اس کا بار بار ذکر کیا جائے لیکن بدقسمت ایشیا میں صرف جاپان ہی ایک ایسا خوش نصیب ملک ہے۔ جو اس لحاظ سے ممالک یورپ کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت جاپان میں بعض اخبار ایسے ہیں جن کی اشاعت روزانہ بیس لاکھ ہے اور لطف یہ ہے کہ ان میں سوائے سیاسی، اقتصادی، علمی و ادبی مضامین کے اور کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ یورپ کے اخبارات میں محض توسیع اشاعت کے لئے جرائم اور طلاق وغیرہ کے قصے بھی درج کئے جاتے ہیں۔

ان جرائد میں سے ایک جریدہ کی آمدنی بارہ ملین ڈالر (یعنی تقریباً ساڑھے تین کروڑ روپیہ) سالانہ ہے جس میں خالص نفع ڈھائی ملین گنی ہوتا ہے۔ یہ سنکر ممکن ہے کسی کو شک پیدا ہو کیونکہ جاپان کی وسعت صرف امریکہ کے ایک صوبہ کالیفورنیا کے برابر ہے اور آبادی صرف ساڑھے چھ کروڑ ہے (حالانکہ اس کے مقابلہ میں امریکہ کی آبادی گیارہ کروڑ سے زیادہ ہے) لیکن یہ واقعہ ہے کہ آبادی اور وسعت کے لحاظ سے جاپان کی صحافت امریکہ کے مقابلہ میں زیادہ وسیع و ترقی یافتہ ہے

جاپان میں اس وقت ۱۱۲۷ روزانہ اخبار، ۲۸۵۰ ہفتہ وار اور ماہوار رسائل شائع ہوتے ہیں۔ اور روزانہ اخبارات کی مجموعی اشاعت دس کروڑ ہے۔ یعنی ہر چھ آدمی کے لئے ایک کاپی شائع ہوتی ہے۔ اس ترقی کا راز صرف وہاں کی وسعت

تعلیم ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ مدارس ابتدائی سے فارغ ہونیوالے طلبہ ۹۱ نیصدی ثانوی مدارس میں جاتے ہیں اور جملہ مدارس کی تعداد وہاں ۴۴۰۰۰ ہے جن میں ایک کروڑ ۵ لاکھ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔

وہاں مطالعۂ کتب کا شوق جسقدر بڑھا ہوا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۱۹۲۵ء میں ۱۰۰۸۲ کتابیں مختلف علوم وفنون کی شائع ہوئیں اور یورپین ممالک کی کتابیں ۵ لاکھ گنی قیمت کی ملک میں آئیں۔

ابھی ہمنے ذکر کیا ہے کہ جاپان کے اخباروں کی اشاعت ایک کروڑ تک پہونچی ہوئی ہے اس کی تقریباً نصف اشاعت صرف اُن دس بڑے بڑے اخبارات کی ہے جو ٹوکیو اور اوساکا سے شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک اخبار کی اشاعت ۱۲ لاکھ اور دوسرے کی ۸ لاکھ روزانہ ہے۔

چھ سال کا زمانہ ہوا کہ اوساکا کے اخبار نے نہایت عظیم الشان عمارت طیار کرائی جو پانچ منزل کی ہے اور جسپر ۲۵ لاکھ گنی صرف ہوئی، اسی طرح ٹوکیو کے اخبار نے ۳ لاکھ گنی صرف ایک عمارت اپنے لئے طیار کرائی۔ ٹوکیو اور اوساکا کے دونوں اخباروں کے درمیان خبریں وغیرہ لیجانے کے لئے ہر وقت پانچ ہوائی جہاز کام کرتے رہتے ہیں۔ ان اخباروں میں باہم مقابلہ بھی نہایت شدید ہے۔ اگر ایک اخبار شام کا اڈیشن مفت تقسیم کرتا ہے تو دوسرا بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ جاپان کے اخباروں کی ایک عجیب وغریب خصوصیت ان کے ضمیمے یا تتمے ہیں جو روزانہ تیرہ تیرہ شائع ہوتے ہیں اور ہر شہر کے لحاظ سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ یہ ضمیمہ ایک چھوٹا سا ورق ہوتا ہے اور اخبار بیچنے والے جب اس کو لیکر نکلتے ہیں تو یہ عالم ہوتا ہے گویا حشر برپا ہے اور ہر شخص اس بے صبری کے ساتھ اس کو لینا چاہتا ہے گویا وہ اندیشہ کرتا ہے کہ کہیں یہ دنیا تباہ ہو جائے اور میں اس خبر کے پڑھنے سے محروم رہوں۔

خبریں حاصل کرنے کے لئے یہ اخبارات بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ ۲۳ء کے زلزلۂ جاپان کی خبریں حاصل کرنے کے لئے اوساکا کے اخبار نے ۴۴ ہزار گنی صرف کی جلد سے جلد خبر حاصل کرنے کے لئے جو اہتمام کیا جاتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جب ۲۶ء میں شاہ جاپان بستر مرگ پر تھا اوساکا اور ٹوکیو کے دونوں اخباری کمپنیوں نے قصر شاہی ہی کے قریب دو مکان کرایہ پر لئے اور وہاں اپنے اپنے مخبر متعین کئے تاکہ ہر لمحہ کی خبر جلد سے جلد مرکز تک پہونچائیں پھر اسی کے لئے نئے ٹیلیفون تصویر لینے کے کیمرے پیام رساں کبوتر، موٹر سائکل، ہوائی جہاز وغیرہ ہر وقت ہر مکان میں طیار رہتے تھے اور ساٹھ آدمی شب و روز جاگتے رہتے تھے۔

اوساکا کے اخبار میں ۲۳۶۵ آدمی کام کرتے ہیں جن میں ۴۰۵ شعبۂ تحریر میں ہیں اور ۳۶۰ شعبۂ ادارت میں۔

امریکہ کی دولت

گزشتہ سال امریکہ کی دولت وثروت اس حد تک پہونچ گئی کہ اس سے قبل تاریخ میں اس کا نظیر نہیں ملتا یعنی زمانۂ قدیم میں بھی کوئی سلطنت ایسی نہیں ہوئی جو اتنی بڑی ثروت کی مالک رہی ہو۔

اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کا قرض اس وقت دوسرے ملکوں پر اس قدر ہے کہ اگر تمام دنیا کی سونے کی پیداوار کو سہ چند کر دیا جائے تو بھی قرض کی مقدار زاید ہوگی۔ اس وقت امریکہ کے بنکوں میں ایک ارب ۹۰ کرور گنی توفیر کی

صورت سے پائی جاتی ہیں اور لکھ پتیوں کی تعداد وہاں گیارہ ہزار سے کم نہیں ہے۔ وہاں کی پبلک کے پاس دو کرور بیس لاکھ موٹر ہیں اور ٹیلیفون اور آلات لاسلکی کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ اگر تمام دنیا کے ٹیلیفون اور آلات لاسلکی شمار کیے جائیں تو بھی امریکہ سے کم ہوں گے۔ تمام ملک میں ریل کا ایسا جال پھیلا ہوا ہے کہ تمام دنیا کی ریلوں سے ۳۰ فی صدی زیادہ ہے صرف وہاں کے سیاح ہر سال ۱۲ کرور گنی صرف کرتے ہیں۔

صناعت و زراعت کے لحاظ سے بھی انکا تفوق ظاہر ہے کیونکہ باوجود اس کے کہ آبادی میں وہ یورپ کے پانچویں حصہ سے زیادہ نہیں ہے۔ تمام دنیا کی زرعی و صناعی پیداوار میں نصف سے زیادہ انکا حصہ ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں ۵۵ فیصدی رہا ۵۱ فیصدی تانبا ۶۲ فیصدی پٹرول، ۴۳ فیصدی کوئلہ، ۵۲ فیصدی لکڑی، ۸۰ فیصدی گندھک اور ۵۵ فیصدی روئی اہل امریکہ نے پیدا کی۔ چنانچہ اسی دولت کا نتیجہ ہے کہ صرف ایک شہر نے ایک سال کے اندر ۵ لاکھ گنی گھونسہ بازی کی تفریح میں صرف کر دئے اور یونیورسٹیوں پر ۶۰ ملین گنی کی جایداد انھوں نے وقف کر دی۔

ضرورت ہے

اگر آپکو خیمے، دریاں اور چرمی سامان کی ضرورت ہو تو فوراً ہمیں ایک کارڈ لکھئے، ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزاں ملتا ہے۔ والی ریاست بڑے بڑے رؤسا ہمارے ہی یہاں سے مال منگاتے ہیں۔ فہرست اردو یا انگریزی کی منگاکر ملاحظہ فرمائیے۔ ہمارا کارخانہ صداقت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا ہے۔ ملنے کا پتہ:-

محمد حسین اینڈ کونٹ مرچنٹ فتحگڑھ یو۔پی

بھاگلپوری ٹسری ریشمی صافی

ٹسری اور ریشمی صافے یا تھان برائے کوٹ، قمیص، شیروانی اعلیٰ درجے کے درکار ہیں تو ہمارے یہاں سے منگاکر استعمال میں لائیے:- ملنے کا پتہ

مولوی کبیر احمد خاں برادرز بھاگلپور سٹی

دارالاشاعت پنجاب لاہور

عورتوں کے لئے کتابیں

وہ تصانیف جو اخبار تہذیب نسواں کے سلسلے میں شائع ہو کر ملک میں بیحد مقبول ہوئیں اور جن کا ہر تعلیم یافتہ گھرانے میں موجود ہونا ضروری ہے

خانہ داری

محترمی محمدی بیگم صاحبہ مرحوم اڈیٹر تہذیب نسواں کی نہایت ہی مفید اور قابل عمل تصنیف جو نہایت سلیس سادہ اور دلنشین انداز میں لکھی گئی ہے اس کتاب میں ۴۴ مضامین ہیں۔ جو خانہ داری کی تمام ضروریات پر حاوی ہیں۔ مکان باورچی خانہ خرید اجناس۔ غلہ و اجناس کی حفاظت۔ کھانے پینے کے متعلق مختلف قسم کی ہدایات۔ مہمان میزبان۔ پوشاک۔ غسل۔ ضبط۔ اوقات۔ کتب خانہ۔ بچوں کی تعلیم و تربیت۔ بیماری اور اس کا علاج۔ زچہ خانہ۔ کفایت شعاری۔ تقریبات۔ خانہ داری۔ اخلاق۔ ان میں سے چند مضامین ہیں کتاب امیروں اور غریبوں کے یکساں طور پر مفید ہے اور کامیاب زندگی کی جانب مستورات کی رہنمائی کرتی ہے۔ قیمت عہ

نعمت خانہ ۔ ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک تمام ہندوستانی کھانوں۔ نیز انگریزی کھانوں بیماروں کی غذاؤں اور اچار۔ چٹنیوں اور مربوں کی نہایت صحیح ترکیبیں۔ خود کئی بار تجربہ کرنے کے بعد لکھی گئی ہیں۔ طبع چہارم قیمت عہ

رفیق عروس ۔ یعنی نئی دلھن کی سہیلی جو اسے سسرال کی زندگی کامیابی سے بسر کرنا سکھاتی ہے۔ طبع چہارم قیمت ۱۲ر

آداب ملاقات ۔ وہ تمام آداب جو مہذب و معزز گھرانوں میں مہماں اور میزباں برتتے ہیں۔ طبع چہارم۔ قیمت ۶ر

طبیب نسواں ۔ عورتوں اور بچوں کے عام امراض کا بیان اور انکی سستی اور مجرب دوائیں۔ ہر بیاہی عورت کے لئے مفید کتاب قیمت عہ

بچے کی تندرستی ۔ بچے کی پیدائش سے لے کر سیانے ہونے تک کی حالت کے متعلق ضروری باتیں اور تدابیر حفظ صحت قیمت ۱۲ر

خواب راحت ۔ ہندوستان کی مشہور اور دلچسپ لوریاں اور بچوں کا دل بہلانے کے فقرے طبع سوم قیمت ۴ر

رسوم دہلی ۔ دہلی کی بیاہ شادی کی دلچسپ رسوم کا تذکرہ قصے کے پیرائے میں۔ قیمت ۴ر

عورتوں کی انشاء ۔ خط و کتابت کی بہترین رہنما کتاب قیمت عہ

ہفتہ وار اخبار تہذیب نسواں

لڑکیوں اور عورتوں کے لئے سب سے پہلا ہفتہ وار۔ پابند اوقات۔ کثیر الاشاعت اور مقبول عام اخبار جو تیس سال سے جاری ہے اور جسمیں خانہ داری۔ مذہب و اخلاق۔ تربیت اطفال۔ حفظ صحت۔ تاریخ و سیر دستکاری اور معاشرتی مسائل پر مقبول و مدلل مضامین شائع ہوتے ہیں اور ہفتے بھر کی ضروری خبریں اور عالم نسواں کے واقعات درج کئے جاتے ہیں۔ نمونہ مفت چندہ سالانہ صہ

دارالاشاعت پنجاب ۱۹۵ ۔ ریلوے روڈ ۔ لاہور ۔